کشتیِ نوح

مصنّفہ

H. G. Wells.

مترجمہ

پروفیسر پریتم سنگھ ایم اے

قیمت ۱۰/

مترجمہ

پروفیسر پریتم سنگھ ایم۔اے لاہور

سنہ ۱۹۴۱ء

بار اوّل　　تعداد ۵۰۰　　قیمت ۱۰/

ملنے کا پتہ

پروفیسر پریتم سنگھ ایم۔اے ۳۹ ٹمپل روڈ

لاہور

تمہید

ایچ - جی ولز صاحب انگلستان میں عصرِ حاضر کے ایک مشہور مورّخ ہیں۔ 'مختصر تاریخ عالم' آپ کی وہ تصنیف ہے جس نے انہیں علمی دنیا میں بطور مورّخ کے روشناس کرایا۔ آپ ایک نئے نظام کے حامی ہیں جو اس جنگ کے بعد قائم ہونے والا ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ اِس نظامِ آئندہ کی بنیاد صلحِ عمومی پر رکھی جائے گی۔ زیرِ نظر کتاب ایک تمثیل کی شکل میں ہے۔ گویا جس طرح حضرت نوح کے زمانہ میں طوفان آیا تھا۔ آج بھی ویسا ہی طوفان آرہا ہے جس کیلئے ایک نئے انداز کی کشتی تیار کی جائے۔ تاکہ موجودہ تمدن کے بیج آنے والے تمدن کے لئے فصل کا کام دیں۔ یہ تمثیل اِس قدر دلچسپ ہے کہ شروع کرکے ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ترجمہ میں سادگی اور عام فہم زبان کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

مترجم

فہرست مضامین

پہلا باب

ایک دردناک پرانی کہانی نئے انداز میں

(۱)

نوح ابن لمک[ا] کو تو پورا یقین ہو گیا تھا کہ دنیا بالکل دیوانی ہو گئی ہے اور انسان کی زندگی میں جو چیزیں قابل قدر و قیمت ہیں وہ تباہ ہو رہی ہیں۔ کہیں کہیں دلیری، وفا اور سخاوت کی جھلک باقی ہے مگر تمام ماحول پر تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ بھلا یہ صفات اب کس مصرف کی ہیں! زمین پر بارود اور توپیں تباہی مچا رہی ہیں اور آسمان سے ہوائی جہاز آگ برسا رہے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا کہ حکومتیں فوجوں کو اس طرح جنگ میں بھیجا کرتی تھیں کہ سپاہی اچھی طرح مسلّح نہ ہوتے تھے اور فوجی افسر بھی کچھ ایسے ویسے ہی ہوا کرتے تھے۔ حکومت روپیہ دیتی تھی اور لوگ بیچارے جنگ میں چلے جاتے تھے۔ مگر موجودہ حکومتوں کا کچھ پوچھو ہی نہیں۔ لاکھوں آدمیوں کو جنگ میں دھکیل رہی ہیں۔ بیچارے غریب اندھا دھند جا رہے ہیں۔ اور انجام بھی نامعلوم۔ کون جیتے کون ہارے! آخر کیا ہوگا کون جانے! جدھر دیکھو جنگ۔ ظلم اور تباہی جاری ہے!

[ا] حضرت نوح کو نوح ابن لمک کہتے ہیں۔ Lamech

اِبنِ ملک کو دنیا کی یہ حالت دیکھ کر کچھ عرصے بعد یہ بات ذہن نشین ہو گئی کہ حقیقت میں جنگ ایک بڑی بھاری مصیبت ہے۔ وہ خود ایک بڑا ہی ہوشیار اور کام کرنے والا شخص تھا اور اُسے پورا یقین تھا کہ عالم انسانی ایک نیا نظام قائم کرنے والا ہے اور صلح عمومی قائم ہونے والی ہے اور کمالات انسانی ظہور پذیر ہونے والے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ دیکھ رہا تھا کہ دنیا تباہی اور بربادی کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے اور موت کے مُنہ میں جا رہی ہے۔ اُس کی اُمید یاس سے بدل جاتی تھی۔ عقل کہتی تھی کہ مصیبت آنے والی ہے مگر دل نہ مانتا تھا۔ پہلے سے ہی اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جب جنگ سر پر آپہنچی تو وہ ششدر سا رہ گیا۔ وہ خود ہی تو پیشگوئی کر چکا تھا۔ دل ہی دل میں کہنے لگا کہ انسان عادت سے مجبور ہے۔ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ ایسی دنیا جس میں انسان اپنی مرضی کا مالک نہ ہو اور کچھ خلق نہ کر سکے بھلا کس کام کی! اب تک تو انسان جوں توں کر کے دن گذارتا رہا ہے مگر اب تو قیامت آگئی ہے۔ پچھلے زمانوں میں بھی بڑے بڑے آدمی گذرے ہیں اور وہ بھی مرنے میں زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ آخر وہ کہاں گئے؟ ہمارا بھی وہی حشر ہوگا۔ طلوع کے بعد غروب لازمی ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ اُس زمانے کے لوگ اِن باتوں سے ناواقف تھے اور ہم جانتے ہیں۔ مگر جاننے سے کیا حاصل؟

غرض اِن سوالات کا جواب بن نہ پڑتا تھا۔ آخر دوسروں سے کیا کہتا۔ اور وہ بھی کیا کرتے۔ سوچا کہ زندگی کے دن گذار لو۔ آخر اندھیرا تو ہو گا ہی۔ بیچارہ جوں توں کر کے وقت گذارتا تھا۔ مگر اُس کا دِل بیٹھا جاتا تھا۔ چہرے پر مایوسی کے آثار نمودار تھے۔ وقت نزدیک آ رہا تھا۔ اگرچہ ابھی آیا نہ تھا۔ شاید کوئی بچاؤ کی

صورت نکل آئے۔ مگر اُسے کچھ نہ سوجھتا تھا!

لکھنے کی میز سامنے تھی۔ مگر کچھ لکھتا نہ تھا۔ مطالعہ کرنے والے کمرے میں جاتا تھا۔ مگر کچھ نہ پڑھتا۔ وہاں بیٹھا اُس دن کا انتظار کرتا تھا۔ بیچارہ دل کس طرح بہلاتا۔ دل تو کسی چیز میں لگتا ہی نہ تھا۔ گھنٹوں بے ہوش سا پڑا رہتا۔ کئی طرح کے خیال دل میں آتے اور جب ذرا ہوش آتا تو بڑا پشیمان ہوتا!

اتنے میں کوئی شخص ملاقات کے لئے آیا۔ اُس کی اطلاع کی گئی۔ نہیں معلوم کون تھا۔ خادمہ جسکا نام میبل تھا اپنے مالک سے کہنے لگی۔ صاحب! کوئی شخص نیچے انتظار کر رہا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک ضروری اور خفیہ بات کہنی ہے۔

ابن لمک نے کہا کہ نام دریافت کرو۔

خادمہ کہنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص کہیں سے بھاگ کر آیا ہے۔

اچھا نام تو پوچھ کر آؤ۔

اجی وہ تو کہتا ہے کہ مَیں خدا قادرِ مطلق ہوں اور مَیں نے زمین اور آسمان کو بنایا ہے۔

مالک نے کہا یہ تو مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔

جناب وہ شخص تو ایسا ہی کہتا تھا۔

ابن لمک نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد پوچھا کہ اُس شخص کی داڑھی بھی ہے؟

جناب ہاں۔ داڑھی بہت لمبی ہے۔

---

* Mabel

اور کیا آنکھیں نیلے رنگ کی ہیں؟
جی ہاں - بڑی چمکتی ہیں۔
ابن ملک کہنے لگا بھلا پاگل خانہ یہاں سے کتنی دور ہے؟
جناب ابھی دیکھتی ہوں۔
اچھا میبل ذرا پوچھو تو سہی کہ پاگل خانے سے کوئی شخص بھاگ کر تو نہیں آیا؟

ذرا ٹیلیفون پر[1] ڈاکٹر برشٹ سے بات کرنا اور اس کی رائے لینا اور کہنا کہ اگر فرصت ہو تو تشریف لے آئیں۔
نیچے جاکر اس شخص سے کہنا کہ ذرا انتظار کرے۔ ابھی تو مجھے اپنا ہی ہوش نہیں۔ میں بھلا ملاقاتیوں کو کیا کروں؟
اتنے میں وہ اجنبی کمرہ میں ہی آن پہنچا اور چپکے سے ایک اونچی آرام کرسی پر آ بیٹھا۔ خبر تک نہ ہوئی۔ ابن ملک نے یہ کرسی ملاقاتیوں کے لئے رکھ چھوڑی تھی اور وہ حضرت اسی پر آ بیٹھے۔
یہ شخص جسم کا بھاری اور بڑی عمر کا تھا اور چہرے سے متانت ٹپکتی تھی مگر تھا ذرا فکر مند۔ سر کے بال بالکل سفید اون کی مانند تھے۔ آنکھیں جیسے میبل نے بیان کیا تھا چمکتی نہ تھیں۔ اس نے یہ بات تاڑ لی تھی اور اس شخص کی چال ڈھال سے یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ پاگل خانے سے بھاگا ہوا ہے۔
وہ شخص بڑی سنجیدگی اور دھیمی آواز سے کہنے لگا۔ جناب کا اسم مبارک

---

[1] Telephone at Dr. Burchett

نوح ابن لمک تو نہیں؟

جی ہاں مجھے ابن لمک کہتے ہیں۔ ساتھ ہی اُسے یاد آیا کہ یہ نام تو توریت میں بھی آیا ہے۔ (حضرت نوح کی طرف اشارہ ہے)

اُس شخص نے پھر دوبارہ اپنے الفاظ کو تولا اور کہا۔ دیکھئے تاریخ کس طرح اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اگرچہ تھوڑا سا فرق پڑ ہی جاتا ہے۔ فرق تو پڑنا ہی ہوتا۔ جناب میں نے آپ کا نام ڈائرکٹری[1] میں تلاش کیا۔ اتفاق سے مل گیا۔ میں بڑا خوش ہوا۔ ناموں میں مطابقت[2] تھی۔ میں نے آپ کے متعلق دریافت کیا۔ دل چاہا ملوں اور آپ سے سنجیدگی سے بات چیت کروں۔ مجھے ذرا دیر ہوگئی۔ دیر تو ضرور ہوگئی مگر دل کھول کر بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ وقت ضرور لگے گا۔

اتنے میں اُس نے میبل کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا اور کہا مجھے ایک راز کی بات کہنی ہے۔ آپ تشریف لے جایئے۔ میبل وہاں سے نہ ہلی۔ بھلا وہ اپنے پتلے دُبلے مالک کو جس کی وہ محافظ اور دایا بھی تھی کیس طرح ایسے مشکوک شخص کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیتی!

چنانچہ اب مالک نے خود خادمہ سے کہا کہ جاؤ۔ یہاں مت ٹھہرو اور اُس شخص کی طرف متوجہ ہوا۔

خادمہ نے خوب غور سے اُس شخص کا جائزہ لیا اور چل دی۔ چنانچہ انہوں نے دروازہ بند کرلیا۔

---

[1] Directory

[2] یعنی حضرت نوحؑ اور آپ کے نام میں مطابقت تھی

(۲)

کچھ عرصہ کے لئے اِبن لمک اور وہ شخص ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

اب اُس اجنبی نے کہا۔ جناب آپ کا ایسا خیال کرنا کہ مَیں وہ قادرِ مُطلق خدا نہیں ہوں بالکل بجا تھا۔ اِس میں تو شک نہیں کہ مَیں ایک پرائیویٹ[1] پاگل خانے میں کچھ دیر رہا ہوں۔ میرے متعلق لوگوں کو یہ خیال ہے کہ یہ شخص ایک معمہ سا ہے۔ مگر جناب کو آہستہ آہستہ معلوم ہو جائے گا کہ میں خدا ہی ہوں اور لازمی طور پر آپ مجھے جان جائیں گے۔ مَیں نے اپنے آپ کو بہت کچھ روک رکھا ہے اور وہ بھی ارادتاً۔ مَیں اِس کائنات کو درہم برہم کرنا نہیں چاہتا کیونکہ اسے تو اسی طرح چلتے ہی رہنا ہے مگر کیا کروں حالت بڑی خراب ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ۔۔۔۔ اتنے میں وہ شخص کھانسا اور ذرا رُک گیا۔

پھر کہنے لگا۔ آجکل نوجوانوں میں ایک عام بیماری ہے۔ جناب جانتے ہی ہوں گے۔ اُسے خودکشی کہتے ہیں۔ یعنی لٹک کر یا گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر مر جاتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح مر جاتے ہیں۔ میں بھی یہی کام کرنا چاہتا ہوں۔ مگر بڑے پیمانے پر۔ میں گویا کائنات میں لپیٹ کر خودکشی کر لوں گا۔ اور یہ سب کچھ میرے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ میرا دل تو بہت چاہتا ہے کہ ایسا کیا جائے۔

ابن لمک نے کہا یعنی یہ سب کچھ ملیا میٹ کرنا چاہتے ہو؟

---

[1] Private

اُس شخص نے کہا کہ کیوں نہ کروں؟ مَیں بھی تو کائنات میں ہی شامل ہوں۔ مگر معلوم رہے کہ مَیں کُل کائنات کو چلا رہا ہوں۔ مَیں ہی تو وہ علت اولیہ ہوں اور مجھے ہی لوگ وہ عظیم ہستی تصور کرتے ہیں جسے خدا کہا جاتا ہے۔ عظیم کو تو جانے دیجئے علتِ اولیہ تو مَیں ہوں ہی۔

جناب کے دماغ میں اس قسم کا خیال سما نہ سکیگا۔ بس مَیں اس کے متعلق اور کچھ نہ کہوں گا۔ اگر مَیں نے اِس کائنات اور موجودات کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تو بس یہ ختم ہی سمجھو۔ پھر مَیں کہاں اور آپ کہاں اور یہ سب کچھ کہاں؟ یہ کائنات تو چنیتم زدن میں ختم ہو جائے گی اور یہ عمل کوئی تکلیف دِہ بھی نہیں ہوگا۔

تب ابن لمک نے کہا کہ بس اسے ختم کرو۔ ختم کیوں نہیں کرتے ہو؟

وہ شخص بولا۔ ختم تو کر چکا ہوں اور مَیں خود بھی ختم ہو گیا تھا۔ اب پھر سے آیا ہوں اور اس کائنات کو اور جناب کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔

(نوٹ۔ اب ابن لمک اپنے آپ کو نوح کہنے لگا۔)

نوح بولا۔ مَیں نے تو کچھ نہیں دیکھا۔

وہ شخص کہنے لگا۔ دیکھتے کیسے؟

نوح نے کہا۔ کائنات تو ویسی کی ویسی ہی چل رہی ہے۔ اسے ہمیشہ کیلئے ختم کرو۔ مَیں ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔

اُس شخص نے کہا۔ اگر ختم کر دوں تو مَیں کہاں جاؤں؟ اِس کائنات کے سلسلہ کو تو چلتے ہی رہنا چاہیئے۔ بند کیا تو خود بھی گئے۔

نوح نے کہا بھئی ہم تو پہلے ہی ختم ہو چکے ہیں۔ آپ کے آنے سے پہلے مَیں

تو مُردہ دِل لئے بیٹھا تھا۔

اِتنے میں نظر اُٹھا کر دیکھا تو نوح بڑا پشیمان ہُوا اور کہنے لگا۔ مَیں یہ کیا کہہ رہا ہوں؟ تب اُس شخص کے مُنہ کی طرف غور سے دیکھا تو دیکھتے ہی خیال آیا کہ یہ نفیس سفید ریش شریف آدمی بلا شُبہ معلوم تو خدا قادرِ مطلق ہی ہوتا ہے اُس کا دعوےٰ شاید درست ہی ہو۔ اور انجیل مقدس بھی تو ہمیں اسی طرح بتلاتی ہے۔ پھر خیال آیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو ٹیڑھی کھیر معلوم ہوتی ہے۔ آخر ہے بھی مشکل سوال! کہنے لگا۔ اچھا آپ کہتے ہیں کہ بندہ نوحؑ ثانی ہے اور ملک بھی اُسی ملک کی دوبارہ آمد ہی سہی۔ اچھی بات۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ یہ تو بتلایئے۔ حضرت نوحؑ کی تو بیوی تھی اور میری بیوی تو کئی برس ہوئے مر چکی ہے اور اُس کے تو تین لڑکے تھے جن کا نام سمؔ حامؔ اور یافتؔ تھا اور میرے ہاں تو کوئی اولاد نہیں۔

خداؔ[1] بولا۔ آپ کہتے ہیں کہ میرے ہاں اولاد نہیں۔ جناب عالی جب کمال اور صداقت سے آپ کتابیں تصنیف کرتے ہیں بھلا وہ اولاد نہ ہوئی تو اور کیا ہُوا؟ اور یہ بات اُس نے اِس انداز سے کہی کہ نوحؑ کو بالکل یقین آ گیا۔

مگر۔۔۔۔

اتنے میں خدا نے کہا کہ مصنفین کی مثال مچھلیوں جیسی ہُوا کرتی ہے۔ وہ پانی کی سطح پہ انڈے دیتی ہیں اور کچھ دنوں میں وہ انڈے مچھلیاں بن کر دوسری مچھلیوں کے ساتھ آ ملتی ہیں۔

---

[1] سفید ریش شریف آدمی اپنے آپ کو خدا کہتا تھا۔

تب نوح کہنے لگا۔ میرے دل میں تو بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ میری بیوی میرے گھر میں واپس آجائے۔ کیا آپ کا یہ مطلب ہے؟ میری حالت زار کو تو دیکھئے وہ آگئی تو کیا کہے گی؟

خدا نے کہا۔ خاطر جمع رکھو۔ یہ میرا ذمہ رہا۔ اب اگر تمہاری بیوی تمہارے پاس لوٹ کر آئی تو وہ پہلے کی طرح نہ ہوگی۔ بلکہ اصل معنوں میں بیوی ہوگی گھر کا کام کاج کرے گی۔

نوح نے پوچھا یعنی کیا؟ میں سمجھا نہیں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

خدا نے کہا تفصیلات مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سنبھال لوں گا۔ میں نے صدیوں سے فرشتے بنا رکھے ہیں۔ اُن کے ذمہ کام لگا دیتا ہوں۔ وہ سب کچھ کام کر دیتے ہیں۔ وہ جانیں اور اُن کا کام۔ تم جانتے ہو خدائی کام عجیب ہوا کرتے ہیں۔ یہ تو میرا کام ٹھہرا۔ ہاں مشکلات ضرور پیش آتی ہیں۔

جب نوح نے یہ لفظ سُنے تو اُس کا اعتقاد ایسے خدا پر سے بالکل اُٹھ گیا اور وہ کہنے لگا یہ بوڑھا شریف آدمی معلوم ہوتا ہے کسی پاگل خانے سے بھاگ نکلا ہے۔ بھلا یہ فرشتوں کو کیسے بنا سکتا ہے؟ پھر دل میں خیال آیا کہ ابھی پاگل خانے سے کوئی نہ کوئی آتا ہوگا۔ تب تک تو اسے باتوں میں لگائے رکھوں۔ پھر دل میں خیال آیا کہ نہ معلوم یہ شخص خدا ہی ہو۔ کیا عجیب ہے! اِس اُتار چڑھاؤ کا کچھ خیال نہ کرتے ہوئے اور اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے خدا نے کہا۔

"جب میں نے کائنات کو خلق کیا اور اپنے آپ کو اُس میں بلیٹ ڈالا اور سب کچھ چھوڑ کر تیار ہو گیا۔ تو میں نے ارادتاً مستقبل کا خیال ترک کر دیا۔ گویا

یوں سمجھو کہ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ اب جو ہو سو ہو۔ میں تو آنکھیں بند کرکے جو کرتا ہے کر گذروں گا۔ جب تک میں ہوں تب تک بھلا ہمہ بین کیسے ہو سکتا ہوں۔ علمائے دین نے تو مجھے ہمہ بین کہہ رکھا ہے۔ یہ اُن کی حماقت ہے۔ وہ جاہلِ مطلق بھلا کیا جانیں! یہ بات تو عقل کے منافی ہے۔ اگر عالم وجود ساکت ہوتا تو خدا ہمہ بین ہو سکتا تھا۔ یعنی اگر کوئی ہمہ بین ہو تو جو کچھ حال میں ہو رہا ہے اُسی کو تو دیکھ سکیگا اور اُس کو پوری طرح دیکھ لیا تو پھر آئندہ کوئی واقعہ کس طرح ہو سکیگا؟ ایسا خدا پھر زندہ خدا کیسے ہوا؟ زندگی کے بعد تو موت ہوتی ہے مگر میں تو زندگی چاہتا ہوں۔ کچھ نئی بات ہونی چاہیئے۔ مگر مجھے تو نا امیدی اور یاس ہی دکھائی دیتی ہے۔ میں نے خیال کیا تھا کہ کائنات مجھے نئے کرشمے دکھاتی رہے گی۔ اُس میں کوئی بہشت بریں ہوگا اور اُس میں محبت کا مظاہرہ ہوگا۔ ہر عاشق کے لئے ایک معشوقہ ہوگی اور اُن کا آپس میں پیار ہوگا۔ میں نے خیال کیا تھا کہ یہ میری ایک لاجواب ایجاد ہوگی۔ میں نے اسی لئے حضرت انسان[1] کو خلق کیا۔ پہلے وہ اکیلا تھا۔ توریت میں کہانی کچھ صاف نہیں بتائی اور لوگ بھی اُسے سمجھ کر نہیں پڑھتے۔ وہ اُسے مقدس کتاب سمجھ کر سب کچھ سچ ماننے لگتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ مجھے اِس قسم کے پاکبازوں سے نفرت ہے۔ وہ جب دعا کرتے ہیں تو یہی چاہتے ہیں کہ کوئی خارق العادت بات اُن کے مفاد کی ہو۔ میں ایسوں سے بھلائی نہیں کرتا۔ بھلا میں کب اِس قسم کی دعائیں قبول کرتا ہوں۔ جب دعا قبول نہیں ہوتی تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ خدا ہماری آزمائش کر رہا

---

[1] آدم کی طرف اشارہ ہے۔

ہے۔ اور وہ پہلے سے بھی زیادہ عاجزی دکھلاتے ہیں۔ اُنہوں نے مجھے کیا سمجھا ہے؟ میں کب ایسی ریاکاری کو پسند کرتا ہوں! وہ میری مقدس کتاب کو پڑھتے بھی تو نہیں۔ یہ بات وہاں صاف کردی گئی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اُسے غور سے پڑھا جائے۔ میں تو راست بازوں کو پسند کرتا ہوں جو میرے نقش قدم پہ چلتے ہیں۔ کتاب مقدس تو بار بار یہی کہتی ہے۔ بھلا چاپلوسی کرنے سے کیا حاصل؟ انسان کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا چاہیے۔ معلوم تو ہو کہ انسان ہے۔

خیر اب حضرت آدم کا قصہ سنیئے۔ میں نے اُسے مرد اور عورت بنایا اور وہ اکیلا تھا۔ یعنی اس کی شادی نہ ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ میرے بہشت (باغ عدن) کی سیر کرے اور متعجب ہو۔ کچھ عرصہ تک ایسا ہی ہوا۔ . . . .

وہ بوڑھا شریف آدمی تب ذرا سوچ میں پڑ گیا۔

نوح نے پوچھا کہ آیا یہ بات درست ہے کہ آپ نے اس دنیا کو ۴۰۰۴ قبل از مسیح خلق کیا؟

خدا نے کہا۔ کیوں نہیں۔ درست تو ہے!

نوح نے کہا۔ مگر . . . . .

خدا نے کہا اب اس میں اگر مگر کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس میں مشکل ہی کیا ہے؟ میں اس کائنات میں پڑا ہوا ہوں اور یہ نظام جاری ہے اور چلتا ہی رہے گا۔ گویا مستقبل (یا آنے والا زمانہ) بھی موجودات میں داخل ہے۔ جس کائنات کی میں علت اولیہ ہوں وہ کیونکر متحرک نہ ہوتی؟ ذرا سوچو

تو سہی یعنی جب کائنات اور مَیں ہستی میں آئے اور موجود ہوئے تو اُس وقت (۴۰۰۴ قبل از مسیح) لازمی طور پر ہم لامتناہی ماضی یعنی گذرے ہوئے زمانہ کو اپنے ساتھ لے کر آئے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو اور کیا کرتے! درختوں کو دیکھو جتنے اُن میں چکر ہوں اُتنے ہی سال اُن کی عمر ہوگی۔ پودوں کو دیکھو پھول پھل اور بیج برابر نکلتے ہی رہتے ہیں۔ حضرت آدم کے بھی ایک ناف ہے جس سے مراد ماں[1] ہے یعنی منبع خلقت۔ کبھی آپ نے اس کتاب[2] کا مطالعہ نہیں کیا؟ یہ کائنات کس طرح چلتی اگر اسے چلایا نہ جاتا۔ یہ بات میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اور ایسے ہی ہونا تھا۔ اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ یا یُوں سمجھو کہ اگر میں، اور آدم اور یہ ساری کائنات مستقبل کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو یہ ماضی کہاں سے ہوتا! میں نے اس معاملہ پر خوب غور کیا۔ اسی لئے میں نے سب سے پہلے یہ کلمہ کہا کہ "نور ہو جا" اور ہو گیا۔ کتاب[3] مقدس تو بالکل درست[4] کہتی ہے۔ مگر یہ بات صاف نہیں کرتی کہ جونہی نور ہوا ساتھ ساتھ سایہ بھی نمودار ہو گیا۔

چنانچہ بوڑھا شریف آدمی ذرا چُپ سا ہو گیا۔ اور کہنے لگا سایہ تو نور کے ساتھ ساتھ ہی ہونا ٹھہرا تا۔ یہی تو ہیگل[5] جو سب سے بڑا فلسفہ دان ہے کہتا ہے۔ کہ کوئی چیز بغیر اُس کی ضد کے نہیں ہوا کرتی۔ میں اِس کائنات میں ایک شخصیت بن کر موجود تھا تو لازمی طور پر میرا سایہ بھی ایک شخصیت ہی ہوئی۔

---

[1] Mother [2] "Gosse's Omphalos" [3] Bible

[4] سایہ سے مراد شیطان ہے [5] Hegel

چنانچہ خدا کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے اور وہ کہنے لگا کہ سایہ تو مجھے بڑا ہی دق کرتا ہے۔ پورا شیطان ہے۔ کتاب مقدس میں پیدائش سے لے کر باقی ساری کہانی اس بات کی شاہد ہے کہ میں آدم کی راحت اور فلاح کے لئے کوشاں تھا۔ مگر شیطان ہمیشہ اپنے منصوبے باندھتا ہی رہا۔ چنانچہ اُس بوڑھے شریف آدمی کو اِس قدر غصہ آیا کہ وہ آگ بگولا سا ہوگیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے موسم گرما میں بادل گرجتے ہوں اور بجلی چمکتی ہو۔ مگر پھر مطلع صاف ہوگیا اور کہنے لگا میرا غضب دیکھا!

خدا نے کہا۔ پہلے میں اِس سایہ کے ساتھ سُلجھ لوں پھر کچھ کام کروں گا۔ اسی لئے تو میں اِس کائنات کا خاتمہ نہیں کرتا۔

نوح کہنے لگا۔ جو جی چاہے سو کیجئے۔ آپ مالک ہیں۔

(۱۳)

بوڑھا شریف آدمی اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ سایہ تو ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اور یہی کہتا رہتا ہے کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا وغیرہ وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ بہشت کا باغ تو بس ختم ہوگیا۔ کیونکہ اگر یہ سلسلہ جاری ہی رہنا ہے تو ایک کے بعد دوسری چیز کا آنا لازمی ہو جاتا ہے۔ ہاں مگر جو چیز دوبارہ آتی ہے پہلی سے ذرا مختلف ہوا کرتی ہے۔ فرق تو لازمی ٹھہرا۔ چنانچہ زبور میں لکھا ہے "ہر صبح نئی محبت" ایسا تو ہونا ہی چاہئے۔ جو لوگ آگے بڑھ رہے ہوں کب تک پرانی چیزوں کو پسند کرتے رہیں گے۔ آخر اُن کی دلچسپی کے لئے کوئی نئی چیز بھی

تو چاہیئے۔ دنیا تو امید پر قائم ہے۔ مثلاً بچے تو پیدا کرنے ہی ہوتے۔
میرے دیکھتے ہی دیکھتے بہشت کا باغ بچوں سے بھر گیا۔ جب میں کہتا
تھا "محبت" تو میرا سایہ پکار اُٹھتا تھا "شہوت"۔ لوگوں کو کھانا پینا اور بچے پیدا کرنے
بھی ٹھہرے۔ میں درندے بناتا تھا اور آدم اُنہیں ہاتھ لگاتا تو وہ دانت دکھاتے
تھے۔ ایک دن شام کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں باغ میں گیا۔ کیا دیکھتا
ہوں کہ اُفق بہت ہی روشن ہے۔ ایک رنگ آتا ہے اور دوسرا جاتا ہے۔ میرا دل
نہایت ہی خوش ہوا۔ ایک دلفریب نظارہ تھا۔ مگر میرا سایہ یعنی شیطان وہاں بھی
اپنا کام کر رہا تھا۔ اُسی وقت ایک بلّی منہ میں چڑیا لئے میرے پاس سے گذری۔
میں نے آدم اور حوّا کو باغ میں سے بلا بھیجا۔ حوّا کو میں نے آدم کا دل بہلانے
کے لئے پیدا کیا تھا۔ وہ دونو ایک جھاڑی کے پیچھے سے نکلے۔ اور بڑے شرمندہ
تھے۔ اور اُنہوں نے انجیر کے پتوں سے اپنی شرمگاہوں کو ڈھانپا ہوا تھا۔
مجھے اُن پر بڑا ہی غصّہ آیا کہ میں نے اُن کے رہنے کے لئے ایسا خوشنما مقام تجویز
کیا تھا۔ اُنہوں نے اُسے بگاڑا۔ اگر وہ سایہ مجھ سے اُلجھتا تو اور بات تھی۔ وہ تو میری
جنت پر آدم اور حوّا کے پاس جا پہنچا اور اُن بیوقوفوں نے اُس کی بات سُن لی۔
اور غضب ڈھایا۔ میں نے صاف طور پر اُن سے کہہ رکھا تھا۔ کہ زندگی کے درخت کے
نزدیک نہ جانا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو اور اُن کو اور سب کائنات کو دم
بھر میں ملیا میٹ کر دوں۔ مگر مشکل تو یہ تھی کہ میں خود اُس میں لپٹ رہا تھا۔ میری بھی
شخصیت تھی اور میرا سایہ جو میرا دشمن تھا اُس کی بھی شخصیت تھی۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں
نے سایہ سے کہا کہ چلو کہاں جاتے ہو۔ بھلا کرو تو سہی کچھ! میں نے خوب سُنائیں اور آدم

اور حوا کو بھی آڑے ہاتھوں لیا اور زمین کو بھی گالیاں دیں - مَیں سچ مچ بڑا غضب ناک تھا . . . . . تب ہی تو مجھے گناہ اور موت خلق کرنے پڑے اور یہ رنج اور الم ظہور پذیر ہوا - اُس وقت سایہ تو بڑا خوش ہوا -

جب میرا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا اور مَیں ہوش میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت آدم جس کو مَیں نے اپنی صورت میں بنایا تھا اور جو میرا ہی پیرو رہ تھا زمین کھود رہا ہے - گویا وہ ایک معمولی ناتراشیدہ کاشت کار کا کام کر رہا ہے اور اُس کی بیوی حوا بیٹھی کھانا پکا رہی ہے اور چرخہ کات رہی ہے اور اُن کے بچوں کی حالت تو ناگفتہ بہ تھی - بالکل بے سمجھ اور اُجڈ تھے - بس باغِ عدن کا بالکل خاتمہ ہو گیا اور یہ قصہ ختم ہوا -

چنانچہ وہ بوڑھا شریف آدمی کرسی کے بازو پر ہاتھ مارتا جاتا تھا اور گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا - بس یہاں تو یہی حال رہنا ہے - ذرا حضرت آدم کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا - پھر دیکھو تو لڑکھڑا کر گر پڑا ہے اور یہ گرنا بھی اخلاقی اور مادی اعتبارات سے ! مَیں پھر قادرِ مطلق خدا تھوڑا ہی رہا - کھیل کود میں گیند پٹخنے والا چھوکرا ٹھہرا - یہ سب کچھ کتابِ مقدس میں لکھا ہوا ہے - مَیں نے اپنی طرف سے تو نہیں گھڑا !

غرضیکہ وہ میری کتاب بڑی مستند ہے - اِس طرح کی مکمل تاریخ کہاں مل سکے گی ؟ ہاں چونکہ مختلف زبانوں میں تلمبند ہوئی ہے شاید کچھ خامیاں رہ گئی ہوں - تاریخیں ذرا گڑبڑ ہیں - مثلاً بعض بزرگوں کی عمر مبالغہ آمیز ہے - مگر مَیں

Skittle alley ایک کھیل کا نام ہے -

عام اصول بیان کرتا ہوں جو قابلِ عمل ہوں۔ بعض خیال تو عجیب تھے۔ کون حساب کرتا ؟ آپ مانیں یا نہ مانیں۔ میرا لکھا ہوا کبھی تصحیح کے لئے میرے پاس نہیں آیا۔ مگر میرے کلام کے حقیقی ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بنی نوع انسان کی ایسی مجمل تاریخ اور کہیں نہیں مل سکے گی۔ شائد تم کہتے ہو گے کہ بہت سی باتیں ناقابلِ یقین ہیں اور ہمیں ماننی پڑتی ہیں۔ کچھ خامیاں دیکھ کر تم خیال کرنے لگتے ہو کہ شائد اصل اور نقل میں فرق ہے۔ ہو سکتا ہے۔ مگر کہانی تو قابلِ یقین ہے۔ ممکن ہے کہیں کمی بیشی کی گئی ہو۔ مگر بالکل غلط تو نہیں۔ ذرا غور کرو۔ . . . .

اتنے میں خدا کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ گرج کی آواز آئی اور غضب ناک لہجے میں کہنے لگا۔ کتابوں کے شائع کرنے والے اور ترجمہ کرنے والے اور تنقید کرنیوالے سب شیطان کے پیچھے ہوتے ہیں۔ نوح سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم بھی تو کتابیں لکھتے رہے ہو۔ وہ سب شیطان کے ہاتھ میں چلی جاتی ہیں۔

نوح نے جواب میں کہا۔ یہ تو سچ ہے۔ میں تو کتابیں لکھتے والے شیطان کے پیچھے ہی!

خدا نے کہا۔ میں نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا تھا۔ دراصل ہوں تو میں رحم دل خدا! مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سب کام الٹا ہو جائے گا اور لوگ مجھے ہی الو بنائینگے۔ میں تو اول سے آخر تک ان پر بھروسہ کرتا رہا اور کہتا رہا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔ لوگ کہتے تھے کہ خدا "محبت" ہے۔ میرے خیال میں تو وہ "امید" ہے۔

نوح نے خیال کیا کہ یہ بحث (مسئلہ زیرِ نظر) ہے تو بڑی دلکش! علمائے دین شائد اسکو سمجھ نہ سکے۔ اس لئے انھوں نے کچھ کا کچھ بنا دیا۔

(۴)

بوڑھے شریف آدمی (خدا) نے کہا کہ میں کئی بار کوشش کر چکا ہوں کہ یہ آدم انسان بنے۔ مگر وہ تو شیطان کے پیچھے ہی بھاگتا ہے۔ میں تو تجربہ ہی کرتا رہ جاتا ہوں کہ آخر اُسے کسی طرح نجات ملے...... پہلے میں نے ایک قوم کو چُنا اور ابرام کے سپرد کیا۔ ابرام سے اُس کا نام ابراہام میں بدلا (۱)۔ میں ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہوں۔ لوگوں کے نام بدل دیتا ہوں۔ مگر کیا فائدہ؟ مجھے کیا معلوم کہ میرا وہ دشمن یعنی وہ سایہ ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔ ابراہام کی اولاد میں یعقوب کو کھڑا کر دیا۔ مجھے بتہ تو چل گیا۔ اضحاق تو بالکل مجھے پسند نہ تھا۔ وہ تو اپنے بوڑھے باپ ابراہام سے بالکل مختلف تھا۔ ہابیل[1] جس کے خاندان میں اضحاق ہوا خود تو بڑا شریف آدمی تھا۔ میں نے تو ابراہام سے کہا تھا کہ اِس لڑکے کی قربانی دے دو اور کام ختم کر دو۔ مگر بعد میں میں ہی کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے کہا جانے دو۔ سو اضحاق بچ گیا اور اُس کے ہاں دو لڑکے ہوئے جو جوڑے تھے مگر ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ میں تو ہمیشہ دل کا صاف رہا ہوں۔ پھر وہ ربقہ[2] والا قصہ ہوا۔ وہ تو بہت ہی دھوکہ دینے والی عورت اور جھوٹی عورت تھی۔ حیرانی تو یہ ہے کہ اُس نے اس پہ اکتفا کی۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں نے جو ابراہام سے عہد کیا تھا اُسے کس طرح سے اِن لوگوں نے توڑا؟ یہ سب قصہ تو کتاب مقدس میں آیا ہے۔ ان سب بزرگوں کے ہاں بیویاں ہوتی تھیں۔ سارا[3]۔ ربقہ۔ راحل[4] وہ سب کے ہاں اولاد کبھی ہوتی تھی۔ مگر جب بچہ پیدا ہوتا تو ساتھ کوئی نہ کوئی معجزہ ضرور ہوا کرتا تھا۔ اور بچہ کا کچھ ہو جاتا تھا۔ ذرا

---

[1] Abel son of Adam
[2] Rebecca [3] Sarah [4] Rachel

غور سے پڑھو تو سب پتہ چل جائے۔ سب ذکر کتاب مقدس میں ہے۔

جب بیتیل[1] کے متعلق میرے عہد کا ذکر آیا تو معاملہ بالکل بگڑ گیا۔ میں تو اپنے عہد پر قائم رہا اور میں نے کہا کہ یعقوب کی اولاد ریت کے ذروں کی طرح پھیل جائے گی۔ اور ہوا بھی وہی۔ میں نے اس کی اولاد کو چنا اور اس کا نام بدل دیا اور بنی اسرائیل رکھا۔ یعقوب اسرائیلی تو تھا ہی۔ وہی کمینہ پن اور تابعداری! آیا یہ لوگ دراصل ابراہام کی اولاد میں سے تھے یا نہیں کیا معلوم۔ بعد میں ابراہام نے قطورہ[2] سے شادی کر لی۔ یہ عورت جوان تھی۔ اولاد بہت ہوئی مثلاً مدیان وغیرہ وغیرہ۔

مگر اسرائیلیوں کا کیا کہوں۔ میرے برگزیدوں میں سے تھے۔ انہوں نے میری بری حالت کی۔ پہلے میں نے انہیں مصریوں کی غلامی میں بھیجا۔ پھر وہاں سے چھڑایا۔ ایک پیغمبر کے بعد دوسرا بھیجا کہ ان کو آگاہ کرے اور سزا دے۔ مگر ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ پھر میں نے مسیح کے آنے کا خیال ان کے سر میں ڈالا اور ساؤل[3] نبی نے اس خیال کو مضبوط کیا۔ بس اسی طرح سے ہوتا رہا۔ میں نے وبائیں بھی بھیجیں اور سخت سے سخت عذاب نازل کئے۔ خود غیب کے پردے میں چھپا رہا۔ مگر میں نے مکمل تباہی اور بربادی لانے کی کوشش نہیں کی۔ کچھ ایسا واقعہ ہو جاتا تا کہ میں رک جاتا۔ عین وقت پر مجھے ایسا احساس ہوتا کہ کوئی کامل انسان ضرور میری مدد کرے گا اور میرا ہاتھ بٹائے گا۔ میں نے خیال کیا کہ اب وقت نزدیک آگیا ہے۔ چلو ایک بار اور دیکھ لوں کہ کیا ہوتا ہے؟

---

[1] Bethel [2] Keturah [3] Saul

پہلے بھی آپ کے ہمنام نوح ابن لمک کے زمانے میں ایسا تجربہ کیا گیا تھا۔ اب بھی کر کے دیکھ لیں۔ میرا ارادہ ہے کہ کل کائنات کو مع عالمِ انسانی غارت کر دیا جائے اور جو من اس غارت گری اور خون خرابہ کے ذمہ دار ٹھیرائے جائیں اور کام ختم ہو۔ اتفاقاً مجھے آپ کا خیال آیا۔

نوح نے کہا۔ درست ہے۔

خدا نے کہا۔ تو میری تجویز یہ ہے کہ میری مدد سے اور میری زیر نگرانی آپ ایک کشتی تیار کرائیں۔ نوح ابھی کچھ کہنے کو ہی تھا کہ خدا فوراً بول اٹھا کہ تفصیلات فی الحال رہنے دیجئے۔ میری تجویز یہ ہے کہ میری مدد سے اور میری ہدایت کے مطابق آپ ایک کشتی تیار کرائیں اور وہ کشتی جو آپ کے پٹے بالکل ایک کامیاب کشتی ہو۔ ہم اُس کشتی میں جو کچھ اِس دنیا میں رکھ لینے کے قابل ہوگا اور جو پھر سے پیدا ہو سکے نمونہ کے طور پر رکھ لیں گے۔ مثلاً حیوان اور پرندے۔ صنعت و حرفت۔ بڑی بڑی ایجادیں۔ نئی معلومات۔ علم و ادب وغیرہ۔ ہم ان چیزوں کو بڑی احتیاط سے انتخاب کریں گے اور دیکھ لیں گے کہ نہایت ہی عمدہ ہوں۔ گویا موجودہ تمدن کے بیج آنے والے تمدن کے فصل بونے کے لئے کشتی میں ڈال لیں گے اور چل دینگے۔ جب یہ جنگ و جدال کا طوفان بدتمیزی ختم ہو جائے گا اور لڑائی کا تعفن دور ہو جائے گا۔ ہماری کشتی ارارات[1] پہ جا لگے گی۔ تب آپ سب ایک نئی اور پاک و صاف دنیا میں جا پہنچیں گے۔

نوح نے کہا کہ کیا ہم سب لوگ پہنچ جائیں گے؟

---

۱ Ararat

خدا نے کہا کہ ہاں تم اور تمہارے بچے اور تمہارا خاندان۔ تمہاری بیوی جو مجھے مل گئی ہے اور سم۔ حام اور یافث اور ان کی بیویاں اور بچے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ صرف نام تبدیل ہو گئے ہیں ورنہ تمہارے ہمنام نوح ابن لمک کا خاندان تو ویسا کا ویسا ہی موجود ہے۔ اچنبھا تو یہ ہے کہ مشابہت کمال کی ہے اسی لئے تو میرا دل چاہتا ہے کہ بس طوفان . . . .

نوح بول اٹھا ایسا نہ کیجئے۔

اور وہ اس زور سے چلایا کہ بیچارا خدا بھی ڈر گیا۔ ایسا ہرگز نہ کیجئے۔

خدا نے کہا۔ بھلا یہ کیا۔ ایسا کیوں نہ کروں؟

نوح نے کہا۔ آپ ایسا کریں گے تو میری شامت آجائے گی۔ اگر میری جہنمی بیوی لوٹ آئی تو میرا کشتی کے ساتھ کچھ تعلق نہ ہوگا! میں ایسی کشتی سے باز آیا۔

(۵)

تب خدا نے ایک دھیمی آواز میں کہا۔ مجھے تو کبھی خیال تک نہیں آیا کہ آپ اس قدر انتقام لینے والے شخص ہیں۔ مجھے تو بڑی حیرت ہوئی۔

نوح نے کہا کہ بے شک مگر اب تو آپ کو پتہ لگ گیا۔ بھلا آپ کو میری بیوی کی خصلتوں کا کیا علم تھا؟ آپ عورتوں کے متعلق بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔ آپ اس قدر سادہ لوح ہیں کہ آپ نے صرف سارہ۔ ربقہ اور راخل جن کے والدین مشکوک تھے اُن ہی کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی اپنی سہ گونہ (تثلیث) تو میرے خیال میں مذکر ہے نا۔ ہاں جو کچھ آپ نے مریم کنواری کے متعلق بتایا ہے وہ کچھ

نیا سا ہے۔ لوگ اِس خیال کو وہم سمجھا کرتے تھے۔ کتابِ مقدس والے حضرت نوح کی بیوی کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے؟ اُس کا ذکرِ خیر صدیوں سے اِسی طرح چلا آ رہا ہے۔ کسی نے انگلی تک نہیں اُٹھائی۔ مگر میری بیوی تو ایک متلوّن مزاج عورت تھی اور اِس قدر بدطینت اور شوخ تھی کہ پناہ بخدا۔ تین سال تک متواتر مجھے طعنے دیتی رہی اور توہین آمیز گفتگو اور گالیاں تو اُسکا معمول تھا۔ بالکل کوئی بات مانتی ہی نہ تھی اور کبھی چُپ نہ بیٹھتی تھی۔ آخر وہ چلی گئی اور مجھے اُسے طلاق دینا پڑا۔ مَیں اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ مَیں نے پھر دوبارہ شادی کرنے کا کبھی قصد ہی نہیں کیا۔

وہ بوڑھا شریف آدمی کہنے لگا کہ میرے فرشتے مجھ سے کہتے تھے کہ آپ کی بیوی تو بڑی ہوشیار تھی، اور بعض نے تو اُس کی بڑی ہی تعریف کی۔

نوح کہنے لگا۔ بھلا فرشتوں کو اتنی تمیز کہاں؟ وہ تو آج ہیں اور کل غائب یہ سب دکھلاوا تھا۔ کہاں کی لیاقت! وہ عورت عجیب پتے باز تھی۔ ادبی اداروں میں جا گھستی۔ تقریریں، تبصرے اور تنقیدیں گھڑ لیتی۔ کوئی جوان مصنف مِل جاتا بس اُس کے ساتھ چل دیتی۔ کہتی تھی ایسے شخصوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔ جب مَیں کچھ ادبی کام کرتا تو وہ حسد کے مارے جل مرتی اور خود اپنے آپ کو بطور مصنف پیش کرتی۔ بھلا یہ کوئی بات ہوئی!

خدا نے کہا کہ اگر آپ کے ہاں بچے ہوتے تو شاید۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نوح نے کہا۔ بچے کہاں سے ہوتے۔ طبیعتیں تو بالکل مختلف تھیں۔ وہ ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ اُس کے جذبات لامحدود ہیں اور وہ کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ مجھے ایسی باتوں سے بڑی نفرت تھی۔

نوح ذرا سوچ میں پڑ گیا اور کہنے لگا۔ ایسے ناگوار تجربات کو دہرانے یا یاد کرانے سے کیا حاصل ہے اب تو وہ جاتی رہی اور خدا کرے پھر کبھی واپس نہ آئے۔

خدا نے نوح کے غضب کا مشاہدہ کیا۔ اور بہت سی ناقابلِ یقین باتیں بھی اُس کی سمجھ میں آنے لگیں اور اُس نے نوح سے پوچھا:۔

مانا کہ آپ کا اور آپ کی بیوی کا مزاج مختلف تھا۔ مگر آپ اِس بات کو تو قبول کرتے ہیں کہ آپ کی بیوی نہایت ہی خوش طبع اور بڑی ہوشیار تھی۔ اُس کے مزاج میں عورتوں کی سی کم ظرفی تو تھی مگر تیز بھی تھا۔

تب ہی تو آپ میں اور حضرت نوح میں اتنی مطابقت دکھائی دیتی ہے۔

مجھ میں اور حضرت نوح میں! مگر کتاب میں لکھا ہے کہ حضرت نوح کی بیوی تو بالکل خاموش رہتی تھی۔

خدا نے کہا۔ درست ہے۔ حضرت نوح کی بیوی بلا شبہ نہایت ہی پاک دامن تھی اور یہ چار ہزار دو سو ننانوے برس کا واقعہ ہے۔ (یہ بات خدا نے نہایت متانت اور آہستگی سے بیان کی اور بیان کرتے ہوئے ایک ہاتھ کی انگلی کو دوسرے ہاتھ کی انگلی پر مارا) بے شک بچوں کے پاس جو کشتی کا کھلونا ہوتا ہے اُس میں بھی حضرت نوح کی بیوی کو بڑا ہی خوبصورت مگر سادہ پوشاک میں دکھلایا گیا ہے۔ اور ٹوپی بھی ایسی پہنائی گئی ہے جس طرح ایک غریب اُستانی ہو۔ رخساروں پر صحت کے نشان ہیں۔ اگرچہ وہ پوڈر[1] نہ لگاتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں کیا گیا۔ کتاب مقدس میں تو صرف واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ وہاں معنی تھوڑے ہی سمجھائے گئے ہیں۔ بزرگا

---

[1] Powder

دین اور پیغمبر اکثر فالتو باتوں سے اجتناب کیا کرتے تھے۔ مگر آپ کی بیوی کی اور بات تھی۔ آپ جانتے ہیں۔ کاش کہ لوگ کتاب مقدس کو غور سے پڑھتے!

نوح نے جواب میں کہا کہ ہر مصنّف یہی چاہتا ہے۔ اچھا حضرت نوح کی بیوی کے متعلق کچھ کہیئے۔

خدا نے کہا کہ میں نے کچھ واقعات بیان کئے ہیں۔ اُن سے تو ہر بات ثابت اور ظاہر ہے۔ ذرا غور کیجیئے۔ ایک تو اُن کے تین بیٹے تھے۔ ایک کا رنگ تو بہت ہی کالا تھا اور اُس کا نام حام تھا۔ دوسرا ذرا سانولے رنگ کا تھا اور اُس کے بال سیاہ اور گھنگریالے تھے ناک پتلی تھی اور اُسے سّم کہتے تھے۔ تیسرا لڑکا یافت تھا جو نہایت ہی خوبصورت تھا۔ وہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی شمالی قوم کی نسل سے ہے۔ یوں سمجھو کہ اُن میں سے ہر ایک بنی نوع انسان کی کسی نہ کسی نسل کا نمائندہ تھا۔

حضرت نوح خود آپ کی طرح بڑے ہی متین اور پاکباز تھے۔ اور صفاتِ کاملہ متصف تھے۔ اگرچہ آپ ماشااللہ ہر فن مَولا ہیں!

نوح نے کچھ سرد مہری سے جواب دیا۔ درست ہے۔ آپ کے فرشتے اس بات کو دریافت کر کے آئے کہ میری بیوی کسی لحاظ سے مجھ سے کم نہ تھی۔ اسکے تو یہ معنی ہوئے کہ میں اُسے پھر گھر واپس آنے دوں اور اُسے اور جو کچھ اُس پرانی کشتی میں تھا یعنی اُس کے بچے وغیرہ وہ بھی اس نئی کشتی میں داخل کر دیئے جائیں جنا لوالی یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔

خدا نے کہا کہ آپ اپنی بیوی کو نہیں جانتے۔

نوح نے کہا کہ میں تو کئی برس تک اُس کا غور سے مطالعہ کرتا رہا اور خوب

جانتا ہوں۔

خدا نے کہا کہ وہ بھی تو بڑی ہوشیار او رجہاں تک اُس سے ہو سکا آپ سے پیار بھی کیا۔

نوح نے کہا۔ مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ کس قدر بے وفا عورت تھی

خدا نے کہا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ وہ برسوں تک تمہاری لیاقت کی قدر کرتی رہی۔ وہ تمہاری سب تصنیفوں کا مطالعہ کرتی رہی اور تمہاری کتابوں کو اپنے بچوں کو پڑھاتی رہی!

نوح نے کہا کہ آپ کی مراد یہ ہے کہ وہ اب واپس آ کے ایسا کریگی؟

خدا نے کہا کہ میرا فرشتہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اگر وہ اب واپس آتی تو آپ کی ہر طرح سے خدمت کرے گی۔ یعنی گھر کے کام کاج کے علاوہ وہ آپ کے لئے سیکرٹری[1] کی خدمت اور ٹائپ[2] اور کتابت وغیرہ کرنے کا کام سرانجام دے گی۔ بغرض ہر طرح سے آپ کی مددگار ہوگی۔

نوح نے کہا کہ وہ تو میں خوب جانتا ہوں۔

خدا نے کہا تو پھر اتنی تجربہ کار عورت آپ کو کہاں ملے گی؟

نوُح نے پھر بھی انکار کیا۔

خدا نے کہا۔ کہ اِس کے کیا معنی؟ آپ بڑے سنگدل معلوم ہوتے ہیں!

نوح نے جواب میں کہا کہ آپ ہی تو کہتے تھے کہ جب تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے تو اُس میں کچھ نہ کچھ فرق ہو ہی جایا کرتا ہے۔ یہی فرق سہی۔ تب تو آپ کیساتھ

---

[1] Secretary [2] Type

ہوں۔ میری طرف سے آپ مطمئن رہیئے گا۔ جو بھی مصیبت آوے آنے دیجیئے۔ مگر نوح کی بیوی اور اُس کے بچے یعنی سیاہ رنگ حام اور پتلی ناک والا سم اور نازک یافت ان سب کو تو تباہ ہی ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا ہو تو میں نئی کشتی بنانے میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ ورنہ مجھے معاف رکھیئے۔

خدا نے کہا بھلے آدمی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

نوح نے کہا کہ جو کچھ آپ نے اپنی مقدس کتاب میں تحریر فرمایا ہے اُسے تو بھلا ایک دفعہ دوبارہ دیکھ لیجیئے۔ آپ ہمیشہ شکایت کیا کرتے ہیں کہ لوگ کتاب مقدس کو بھول گئے ہیں۔ مگر آپ تو جو کچھ آپ نے خود لکھا اُسے بھی بھول گئے ہیں۔

نوح بڑی متانت سے اور صبر سے اُس کی دلائل کی تردید کرتے ہوئے کہنے لگا۔ کیا آپ بھول گئے ہیں کہ نوح ابن لمک شراب پینے لگا تھا؟ کیا آپ یہ بات سچ مچ بھول گئے ہیں۔ اور امر واقعہ نہیں کہ جب وہ سب کو نجات دے چکا اور فارغ ہو گیا تو اُس نے شراب پی۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ایک معزز اور لائق شخص جو اس قدر مشہور ہو اور جس نے اس قدر نمایاں کام کئے ہوں بھلا وہ کیوں شراب پیئے؟ اُس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے اور وہ یہ تھی کہ اُس کی خانگی زندگی آسودہ نہ تھی۔ اور وہ اپنی بیوی سے خوش نہ تھا اور جب وہ ایسی حالت میں ننگا پڑا تھا تو بیوی کہاں تھی؟ کیا وہ اُسے کمبل سے ڈھانپ نہ سکتی تھی؟ یقیناً وہ کہیں بھاگ کر چلی گئی ہو گی! اتنے میں حام تشریف لائے اور اپنے باپ کو اس حالت میں دیکھ کر خوش ہوئے! یہ سب کچھ آپ کی مقدس کتاب میں لکھا ہے اور چونکہ میرے نام اور حضرت نوح کے نام

میں مخالفت ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں یہ سب معصیت سہوں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے!

آپ فرشتوں کو طلب کریں اور ان کو غائب کر دیں کشتی کے خیال کو بالکل جانے دیجئے۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ آپ اِس معاملہ کا ذکر تک نہ کیجئے۔

خدا نے کہا جناب! آپ سچ کہتے ہیں۔

نوح کہنے لگا۔ میں تو آپ کی یاد دہانی کے لئے یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔ یہ تو سب آپ کا ہی قول ہے اور کتاب مقدس میں موجود ہے۔ بھلا میں آپ کو کیسے کچھ سکھا سکتا ہوں؟

خدا نے کہا کہ یہ تو اب معاملہ ہی اور ہو گیا۔ ہاں مگر کشتی تو تیار ہونی ہی چاہیئے۔ بھلا آپ کس کس کو اُس کشتی میں ساتھ لے چلیں گے؟

نوح کہنے لگا۔ یہ تو پھر سوچ لیں گے۔ پہلے تو یہ فیصلہ کیجئے کہ کس کس کو ساتھ نہ لے چلیں۔

جب ہم سب کوہ ارارات پہ پہنچ جائیں گے تو حام سام اور یافث تو یقیناً ہمارے ساتھ نہ ہوں گے۔ ہمارے ساتھ تو صرف چند ایک روشن دماغ۔ دلیر اور صاف دل لوگ ہوں گے۔ ابراہام اور بنی اسرائیل اور برگزیدہ لوگوں سے اب ہمارا کیا واسطہ! ہم کیوں کسی پیغمبر یا نجات دہندہ یا رہبر کو اپنے ساتھ کشتی میں لیں؟ کیوں نہ لوگ اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہوں۔ ایسے شخصوں کا کیوں سہارا لیں؟ فی زمانہ ایسی غلطیاں کیوں کی جائیں؟ یہ تو ایک نیا تجربہ ہے۔ اس کی نوعیت ہی دوسری ہے۔ میرا خیال تو یہی ہے۔ مجھے تو کوئی دوسرا طریقہ نظر نہیں آتا۔

خدا ذرا گھبرایا اور کہنے لگا۔ پھر بھی آپ فرمائیے تو۔

نوح نے کہا۔ مَیں نے کشتی والی بات شروع کی تھی اور اب مجھے ہی اُسے پورا کرنا چاہیئے۔ اب بتایئے وہ بابل کے بُرج والا قصّہ کیا ہے؟

خدا نے آہستہ سے کہا کہ مجھے ڈر تھا کہ آپ اُس کے متعلق مجھ سے ضرور دریافت کریں گے۔

تب نوح نے انگریزی کی انجیل اُٹھائی اور کہا کہ اس میں دیکھیے کہ اصل الفاظ کیا ہیں۔ یہ انجیل نہایت عمدہ چھپی ہوئی تھی اور جیمز[1] اوّل کے زمانہ میں اصلی لاطینی اور یونانی زبانوں سے ترجمہ کی گئی تھی۔ پیدائش کا دسواں باب نکالے لیئے تھا۔ گیارھواں باب ہو۔ لیجیئے دسواں باب ہی ہے۔ نوح نے چند سطریں پڑھیں اور کہنے لگا آپ نے یہ کیا لکھ رکھا ہے؟ لوگ اِس مقدّس کتاب کو اس غرض سے پڑھتے ہیں کہ ہدایت پائیں اور اُن کے دل کو تسکین ہو۔ مگر جب پڑھتے ہیں تو عجیب قسم کی باتیں لکھی پاتے ہیں اور اُن کی کچھ سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ بیچارے بار بار پڑھتے ہیں۔ زبانی یاد بھی کرتے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے سو بھی جاتے ہیں۔ گیت گاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جنابعالی اب سنیئے۔ تب نوح نے بے تحاشہ پڑھنا شروع کر دیا۔ (دیکھو کتاب مقدّس۔ پیدائش باب دسواں)

نوح کے بیٹوں سم۔ حام اور یافت کی اولاد یہ ہیں۔ طوفان کے بعد اُن کے ہاں بیٹے پیدا ہوئے۔ بنی یافت یہ ہیں۔ جُمر اور ماجوج اور مادی اور یاوان اور توبل اور مسک اور تیراس اور جُمر کے بیٹے اشکناز اور ریفت اور تجرمہ اور یاوان کے

---

[1] James I

بیٹے الیسہ اور ترسیس ۔ کتی اور ددانی۔ قوموں کے جزیرے اُنہی کی نسل ہیں۔ تا
کہ ہر ایک کی زبان اور قبیلہ کے مطابق مختلف مُلک اور گروہ ہو گئے۔ اور بنی حام
یہ ہیں۔ کُوش اور مصر اور فُوط اور کنعان اور بنی کوش یہ ہیں۔ سبا اور حویلہ اور
سبتہ اور رعماہ اور سبتکہ اور بنی رعماہ یہ ہیں۔ سبا اور ددان اور کُوش سے
نمرود پیدا ہُوا۔ وہ رُوئے زمین پر ایک سُورما ہُوا ہے۔ خداوند کے سامنے وہ
ایک شکاری سُورما ہُوا ہے۔ اس لئے یہ مثل چلی کے خداوند کے سامنے نمرود سا
شکاری سُورما اور اُس کی بادشاہی کی ابتدا مُلک سنعار میں بابل اور ارک اور
اکاد اور کلنہ سے ہوئی۔ اُسی مُلک سے نکل کر وہ اسور میں آیا۔ اور نینوہ اور
رحوبوت عیر اور کلح کو اور نینوہ اور کلح کے درمیان رسن کو جو بڑا شہر ہے بنایا۔
اور مصر سے لودی اور عنامی اور لہابی اور نفتوحی اور فتروسی اور کسلوحی جن سے
فلستی نکلے اور کفتوری پیدا ہوئے۔

اور کنعان سے صیدا جو اُس کا پہلوٹھا تھا اور حت اور یبوسی اور اموری
اور جرجاسی اور حوی اور عرقی اور سینی اور اروادی اور صماری اور حماتی پیدا ہوئے
اور بعد میں کنعانی قبیلے پھیل گئے۔ اور کنعانیوں کی حد یہ ہے۔ صیدا سے غزہ تک جو
جرار کے راستے پر ہے۔ پھر وہاں سے لشع تک جو صدوم اور عمورہ اور ادمہ اور
ضبوئیم کی راہ پر ہے۔ سو بنی حام یہ ہیں جو اپنے اپنے ملک اور گروہوں میں اپنے
قبیلوں اور اپنی زبانوں کے مطابق آباد ہیں۔ اور سم کے ہاں بھی جو تمام بنی عبر کا
باپ اور یافت کا بڑا بھائی تھا اولاد ہوئی۔ بنی سم یہ ہیں۔ عیلام اور اسور
اور ارفکسد اور لود اور ارام اور بنی ارام یہ ہیں۔ عوض اور حول اور

جنز اور ستس۔ اور ارفکسد سے سلح پیدا ہوا اور سلح سے عبر۔ اور عبر کے ہاں دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ایک کا نام فلج تھا کیونکہ زمین اُس کے ایام میں بٹی اور اُس کے بھائی کا نام یُقطان تھا۔ اور یُقطان سے الموداد اور سلف اور حصارماوت اور ارخ اور ہدورام اور اوزال اور دِقلہ اور عوبل اور ابی مائیل اور سبا اور اوفیر اور حویلہ اور یوباب پیدا ہوئے۔ یہ سب بنی یُقطان تھے۔ اور ان کی آبادی میسا سے مشرق کے ایک پہاڑ سفار کی طرف تھی۔ سو بنی سم ہیں جو اپنے اپنے مُلک اور گروہوں میں اپنے قبیلوں اور اپنی زبانوں کے مطابق آباد ہیں۔ نوح کے بیٹوں کے خاندان اُن کی گروہوں اور نسلوں کے اعتبار سے یہی ہیں۔ اور طوفان کے بعد جو قومیں زمین پر جا بجا منقسم ہوئیں وہ ان ہی میں سے تھیں۔"

نوح نے کتاب کو جھٹ بند کر دیا۔ اور خدا سے پوچھا اب کہئے خدا تعالی؟

خدا نے کہا کہ کیا آپ کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ میری دماغ کی اختراع ہے؟

نہیں۔ یہ تو سب پہلے سے تحریر میں آچکا ہے۔ اور پرانے صحیفے بھی نہائت ہی دلچسپ ہیں۔ اور وولی[1] جیسے محققین بھی اُن کی تصدیق کرتے ہیں۔ ہاں یہ تحریرات کہیں کہیں مشکوک ضرور ہیں۔

نوح نے کہا۔ اِن صحیفوں کا بھی وہی حال ہے جو تاریخوں کا ہے۔ کچھ ایسی ویسی ہی معلوم ہوتی ہیں۔ اقتصادیات کی کتابوں میں بھی اسی طرح کا مصالحہ گھڑ کے بھر دیا جاتا ہے۔ خیر جانے دیجئے۔ یہ تو میں نے ویسے ہی دیکھ لیا تھا۔ اب ٹھیک ٹھیک بتائیے کہ آپ نے بائبل میں کیا کچھ کہا ہے وہ تو ایک عجیب سرگزشت ہے۔ کتاب مقدس میں

---

[1] Woolley

وہ کہانی ایک معمہ سا ہے۔ بھلا خدا نے انسان کے ساتھ یہ کس قسم کا معاملہ کیا؟ میرے خیال میں میرا مثیل حضرت نوح تب زندہ تھا۔ اور اس کا یہ چشم دید واقعہ ہوگا۔ وہ بیچارہ اپنے دل میں کیا کہتا ہوگا؟ میں نہیں چاہتا کہ میرا بھی وہی انجام ہو۔ آپ نے اُس کے ساتھ بہت عہد کئے آپ کو یاد ہی ہوگا۔ بلکہ آپ نے اُس سے یہاں تک کہا کہ طوفان سے پہلے کمان نہیں دیکھی گئی۔ یہ تو آپ نے بالکل غلط بیانی کی۔ کیا دو ہزار تین سو اُنچاس برس قبل از مسیح جب بارش ہؤا کرتی تھی تو کمان نہ نکلتی ہوگی؟ آپ نے تو کمان کو میثاق کا نشان قرار دیا تھا اور زور سے کہا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ آپ کبھی کچھ کرتے ہیں اور کبھی کچھ۔ کچھ دن تک تو کام چل گیا۔ مگر کب تک! پھر نوح نے اپنے بڑھتے ہوئے خاندان کو جمع کیا اور اُنہیں سِنعار میں لے گیا اور وہاں وہ رہتے رہے۔ وہاں وہ سب اکٹھے ہو کر بابل کا بُرج تعمیر کرنے میں مشغول تھے۔ پھر آپ نے بغیر کسی قصور کے حضرت نوح کی موجودگی میں (اُس وقت اُس کی عمر ۸۰ برس کی ہوگی) وہ سب کام بگاڑ دیا۔ نوح تو آپ کے نقشِ قدم پر چلتا تھا۔ آپ پر پورا اعتماد رکھتا تھا اور آپ کا حکم مانتا تھا۔ بھلا یہ کیا معاملہ ہے؟ اتنے میں نوح پھر کتابِ مقدس کو پڑھنے لگا (دیکھو پیدائش۔ باب گیارھواں۔ آیات ۵ — ۹)

"اور خداوند اُس شہر اور بُرج کو جسے بنی آدم بنانے لگے دیکھنے کو اُترا اور خداوند نے کہا دیکھو یہ لوگ سب ایک ہیں اور ان سبھوں کی ایک ہی زبان ہے۔ اور وہ جو یہ کرنے لگے ہیں تو اب کچھ بھی جسکا وہ ارادہ کریں اُن سے باقی نہ چھوٹے گا۔ سو آؤ ہم وہاں جا کر اُن کی زبان میں اختلاف ڈالیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکیں۔ پس خداوند نے اُن کو وہاں سے تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا۔ سو وہ اُس شہر کے

بنانے سے باز نہ آئے۔ اس لئے اس کا نام بابل ہوا۔ کیونکہ خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبان میں اختلاف ڈالا۔ اور وہاں سے خداوند نے اُنکو تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا۔"

نوح نے خدا سے کہا۔ جنابعالی! بیشتر اس کے کہ میں اور آپ موجودہ عذاب سے لوگوں کو رہائی دینے کے لئے ایک کشتی طیار کرائیں۔ مہربانی کر کے مجھے بتایئے کہ آپ نے یہ کام کیوں کیا؟ اور مجھے کیسے اطمینان ہو کہ آپ مجھے بھی دھوکہ نہ دیں گے؟ اِس بات کو جانے دیجئے کہ آپ خدا ہیں یا نہیں۔

مجھے اس قسم کی سخت کلامی معاف فرمایئے گا۔ میں بڑے غور کے بعد یہ بات کہہ رہا ہوں۔ آپ نے سچ مچ بڑی ہی دغا کی اور میں اس بات کو دُہراتا ہوں۔ نوح جیسے شخص کو اس طرح دھوکا دینا کیا کوئی انصاف تھا؟ اُس بیچارے کا آخر کیا حال ہوا؟ ایسے شخص کو آپ بھول گئے۔ اور کیا وہ آخری عمر میں جبکہ وہ بالکل ضعیف اور کمزور ہو گیا تھا اپنی اولاد کی اولاد کے ساتھ کہیں بھاگ نکلا۔ نہیں بلکہ وہ اُن کو اپنے گذرے ہوئے زمانے کے حالات بتاتا رہا۔

اتنے میں نوح نے پھر کتاب مقدس کھولی اور پڑھنے لگا۔

"الموداد اور سلف اور حصار ماوت اور اراخ اور ہدورام اور اوزال اور دقلہ اور عوبل اور ابی مائیل اور سبا اور اوفیر اور حویلہ اور یوباب وغیرہ وغیرہ" اور اُنکے اور ماتش چھوٹے بچے بیچارے بوڑھے کھبڑے نوح کا مضحکہ اُڑاتے تھے! لیئر[1] بادشاہ کی کبھی یہ حالت نہ ہوتی۔ یہ حالت تو ناگفتہ بہ ہے!

---

[1] King Lear

یہ ہؤا انجام حضرت نوح کا یعنی نوح ابن لمک کا۔ آپ ہی ایسا بیان کرتے ہیں۔ آپ کی ذاتی تحریر موجود ہے۔ اب بتایئے یہ کیا معاملہ ہے اور اِس کی وجہ کیا ہے؟ آپ بھلا کیا جواب دیتے ہیں؟

سچ تو یہ ہے کہ آپ وعدہ ایفا نہیں کرتے۔ عہد کرتے ہیں اور اُسے پورا نہیں کرتے۔ یہودی تین ہزار برس سے یہی چلاّتے آرہے ہیں اور اینک[1] والا معاملہ لیجیئے۔ آپ اُس کے ساتھ تھے۔ کبھی اُس سے جُدا نہ ہوتے تھے۔ بلکہ آپ نے اُس کے مرنے کا بھی انتظار نہ کیا۔ اُسے بھگا لے گئے اور اب وہ کہاں ہے؟

(۶)

وہ بوڑھا شریف آدمی چند دقیقے چُپ سا ہو کر رہ گیا۔ اور ابن لمک ابھی جواب کا منتظر ہی تھا کہ اتنے میں وہ ملاقاتی ایک شفاف شیشے کی طرح چمکنے لگا۔ اُس کے جسم میں ایک مخصوص تبدیلی پیدا ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شیشہ سا بن رہا ہے۔

آخر خدا نے کہا۔ جناب! آپ بڑے ضدّی اور بدمزاج واقع ہوئے ہو۔ میں راستبازوں کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ اور کرتا رہوں گا۔ مگر جتنے شخصوں سے بھی مجھے ملنے کا موقع ملا ہے اور اُن میں اچھے اور بُرے بھی تھے۔ مَیں نے آپ جیسا ضدی شخص نہیں دیکھا۔ خاص کر اُس زمانے سے یعنی (قبل از مسیح) جبکہ مَیں نے دنیا سے علیحدگی اختیار کی۔ آپ بھی جانتے ہیں اور مُنکر تو جانتے ہی ہیں کہ پچھلی اُنیس صدیوں سے مَیں نے دنیا میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ آپ کا دل تو پتھر سا ہو گیا ہے۔ مغربی لوگوں کا دل عموماً سخت ہؤا کرتا

---

[1] Enock

ہے۔ انسان کے دِل اور دماغ کا اگر آپ کی حالت سے اندازہ لگایا جائے تو خاصی تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ میرے دُشمن شیطان نے مجھے پہلے سے ہی یہ کہہ رکھا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ایسا ہونے والا ہے۔ سائینس نے فی زمانہ بہت ترقی کی ہے میں نے اِس عالم کو چلایا اور اب تو اسے چلتے ہی رہنا ہے۔ مَیں نے آپ سے یہ بحث شروع کی۔ اور اب تو بحث جاری ہی رہنی چاہیئے۔ بھلا اس میں شکایت کی کیا بات ہے۔ آپ کا بھی کیا قصور ہے۔ آپ کیا کر سکتے ہیں..... خیر..... خدا کا خوف تو معدوم ہی ہوگیا ہے۔ اپنے کیئے کا کیا علاج؟.... آپ کے سوال کا جواب دینا لازمی ہے۔

مَیں اِس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ نوح کے طوفان کے بعد کے واقعات کے متعلق مَیں نے کچھ دریافت نہ کیا۔ جب حضرت نوح مر گئے تو نہ معلوم کیا ہوا؟ انہیں کہاں دفن کیا گیا۔ یا اُن کی لاش کو پھینک دیا گیا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مَیں نے حضرت نوح کو اینٹ کی طرح چھوڑ دیا۔ نہ معلوم اینٹ کہاں چلا گیا۔ شائد ابھی تک کہیں گھوم رہا ہوگا۔ مَیں کیا جانوں؟

ابن لمک نے ذرا تُرش رُو ہوکر کہا۔ مجھے مجبوراً کہنا پڑتا ہے اور سخت الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ مَیں جاننا چاہتا ہوں کہ پھر میثاق کے کیا معنی ہوتے؟ اب وہی میثاق آپ میرے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔

بوڑھے شریف آدمی نے جواب میں کہا۔ بالکل درُست۔ صحیح۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں اور سچا فرماتے ہیں۔ کم از کم آپ نے کتاب مقدس کو صحیح طریقے سے پڑھا ہے۔ بہت سے لوگ اِس کتاب کو پڑھتے ہیں اور کسی نے بھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ طوفان کے بعد نوح زندہ رہا یا نہیں۔ بلکہ کسی نے اُس کے متعلق دریافت تک بھی

نہیں کیا۔ وہ کچھ آیات کسی صفحہ سے پڑھ لیتے ہیں اور جب پڑھتے ہیں تو اُن کی توجیہ کسی اور طرف ہوا کرتی ہے۔

ابن ملک (نوح ثانی) ذرا چپ ہو گیا اور جواب کا منتظر تھا۔

اتنے میں ملاقاتی نے کہا ابھی میں ایک دو نکات مابعد الطبیعیات کے مضمون پر بیان کر رہا تھا۔ یعنی عالم وجود اور اُس کا شہود کس طرح ہوتا ہے۔ اب میں ایک اور مشکل سوال کا حل پیش کرنے لگا ہوں۔ کون اور مکان کو جس قدر گہری نظر سے دیکھا جائے اُسی قدر اُس میں لامتناہی تبدیلیاں کام کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ معاف فرمایئے گا جو میں بیان کرنے لگا ہوں اُسے ذرا غور سے سُننے گا۔ گمراہوں اور پاکبازوں کی اصطلاح میں اسے ایک رازِ سربمہر کہا گیا ہے۔ اِس کا ذکر اشارتاً میری کتاب مقدس میں بھی آیا ہے۔ میں تو یہ داستان صاف صاف بیان کرنا چاہتا تھا مگر چند وجوہات سے نہ کر سکا۔ جیسا میں کہہ چکا ہوں عالم وجود اول میرے ساتھ ہی وجود میں آیا اور حرکت میں تھا۔ یہ تو میں بتلا ہی چکا ہوں۔

ابن ملک نے بھی سر ہلایا اور کہا جی ہاں۔

ملاقاتی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ پہلی تو یہ بات ہوئی۔ دیگر مسائل تو اِس سے بھی زیادہ عمیق ہیں اور پیچ در پیچ ہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ لوگ سادہ اور نیکی کا راستہ اختیار کریں۔ مگر میرا سایہ علوم طبعی۔ نفسیات اور ریاضی کے ماہرین کو جا پکڑتا ہے اور بگاڑتا ہے...... اور وہ کہنے لگتے ہیں کہ عالم کائنات محدود ہے۔ یہ بات بالکل بیہودہ معلوم ہوتی ہے۔ بھلا کائنات سے باہر جو چیز ہے اُسے وہ کیا نام دیں گے؟ پھر مابعد الطبیعات سے کیا مراد ہوگی؟ یہ کوئی قصہ کہانی

تھوڑا ہی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم ایک ایسے عالم میں رہ رہے ہیں جو بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اِس کے کیا معنی ہوئے۔ بڑھ کر کہاں جاتا ہے؟ پھر کہتے ہیں کہ تین پہلوؤں[لے] کے علاوہ ایک چوتھا پہلو بھی ہے جو روشنی کی رفتار سے چلتا ہے اور یہ بھی بات تو یہ ہے کہ سایہ سائنسدانوں سے کہتا ہے کہ تجربہ کر کے دکھلا دو۔ بھلا بتایئے کہ رفتار کی کیا حد ہے اور حد ہو بھی سکتی ہے یا نہیں؟ آپ کسی رفتار سے چل رہے ہوں جب پتھر پھینکو گے تو آگے کو ہی جائے گا۔ سایہ کہتا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہ ہو تو بھی کیا؟ پھر سایہ کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ خراب ہے۔ میں اُسے کہتا ہوں کہ چلو اسے ایک مخفی راز رہنے دو۔ وہ کہتا ہے کہ سائنسدان اِس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ دِق کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ سایہ خواہ مخواہ دخل در معقولات کرتا رہتا ہے۔ بھلا اِن باتوں کا انسان کے اعمال کے ساتھ کیا واسطہ میری کتاب مقدس میں جو درشتان ہے اُسے اُس کا غذ کے ساتھ کیا واسطہ جس پر وہ چھپی ہوتی ہے؟ اب سایہ کو ایک نئی شرارت سوجھی۔ وہ کہہ رہا تھا یہ کائنات لپیٹی جا سکتی ہے اور اسے لپیٹ ہی دینا چاہیئے!

خدا کی پیشانی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بڑی گہری سوچ میں پڑا ہے۔ پھر کہنے لگا۔ بہت عرصہ ہوا کہ میرا سایہ کہتا تھا کہ میں نے جو انسان کو اپنی صورت پر بنایا یہ کام اچھا نہ کیا کیونکہ ایسا کرنے سے انسان کو خیال ہو گیا کہ وہ بھی کچھ چیز ہے اور چونکہ وہ کائنات کا ایک جزو ہے۔ اس لئے اُسے بھی یہ حق حاصل ہے کہ میں اُسے مشورہ میں اپنا شریک کروں اور وہ بھی کچھ کہہ سکے۔ شاید سایہ یہی

لے Dimensions

شیطان کا یہ منشا تھا کہ خدا اور شیطان دونوں مل کر ایک بات طے کر لیں۔ اگر انسان کو اِس فیصلہ کا علم بھی ہو جائے تو جو جی چاہے سو کرے۔ بلکہ جس طرح اُس کی مرضی ہو اُسی طرح کرتا جائے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ اِس بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہونگے یا نہیں۔ مثلاً کتاب مقدس میں لکھا ہے کہ نیکی اور بدی کے علم کا درخت باغ عدن میں لگ رہا تھا۔ اُس درخت پر وہ مشہور کھانے والا پھل بھی تھا۔ یہ بات تو سمجھ میں آ جاتی ہے۔ مگر وہاں ایک اور درخت کا بھی ذکر ہے۔ جسکا آدم اور حوّا کو بالکل علم نہ تھا۔ اِس پر کتاب مقدس میں زیادہ زور نہیں دیا گیا۔ مجھے اور شیطان کو اُس کے متعلق بڑا فکر ہوا۔ ہمیں آدم اور حوّا کے باغ سے نکالے جانے کے بعد اس بارے میں محتاط رہنا پڑا کہ کہیں وہ "زندگی کے درخت" کا پھل نہ کھا لیں اور ہمیشہ تک زندہ نہ رہ جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے اور شیطان کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ زندگی کا درخت کس جگہ تھا یہ بات کتاب مقدس میں صریح طور پر بیان نہیں کی گئی اور جب معلوم ہی نہ تھا تو بیان کیسے کی جا سکتی ہے۔ ہمیں تو اس بات کی فکر نہ تھی کہ وہ درخت کہاں ہے۔ فکر تو اِس بات کی تھی کہ آدم کو کہیں اتفاق سے اُس درخت کا پھل ہاتھ نہ آ جائے۔ اور وہ اُسے ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے پہلے کہیں کھا نہ لے۔ ہم یہ گوارا نہ کرتے تھے کہ وہ درخت کے پھل کو کھائے۔ بالآخر ہم نے جلدی سے آدم اور حوّا کو اُس باغ سے نکالا اور دروازہ پر کروبیوں کو اور شعلہ زن تلوار کو رکھا۔ تاکہ وہ پھر باغ میں داخل نہ ہو سکیں اور ہم وہاں حفاظت کے لئے گھومتے رہے۔ یہ اصل واقعہ ہے۔

اتنے میں خدا نے نوح کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا۔

نوح نے کہا کہ آپ نے میری بڑی عزت افزائی کی کہ مجھے یہ راز کی بات بتائی۔ میں اس کی بڑی قدر کرتا ہوں۔

خدا نے کہا کہ اس کائنات کے ساتھ ہمیشہ چپٹے رہنے سے میں اب تنگ آ گیا ہوں۔ کبھی جی چاہتا ہے کہ یہ سب دھندا چھوڑ دوں۔۔۔۔۔

جی ہاں آگے فرمایئے۔۔۔۔۔۔۔

ہاں۔ میرے اور شیطان کے دل میں ہمیشہ یہ کھٹکا رہتا تھا کہ ہم آدم کو اب کس طرح سے روک سکتے ہیں۔ ہم نے اُسے شروع میں متحرک کر دیا۔ میں نے پہلی ہی دفعہ تو اس کائنات کو معلق کیا تھا اور جب ہم نے دیکھا کہ یہ سب لوگ شنار میں جمع ہو رہے ہیں اور ایک بڑی عمارت تعمیر کر رہے ہیں اور اُسے اونچا لے جا رہے ہیں تو میرا سایہ کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔ اُس نے کہا نہ معلوم انسان کیا کر گذرے۔ کتاب مقدس کو دیکھو۔ وہاں لکھا ہے کہ "انسان جو کچھ بھی کرے اُسے روکا نہ جائیگا"۔ بس ہم نے فوراً ہی انتظام کیا اور جلدی میں ہم نے نوح سے جو عہد کیا تھا وہ بھی بھول گئے۔ میں کوئی اکیلا اس کام کو کرنے تھوڑا ہی گیا تھا۔ میرے ساتھ شیطان تھا۔ کتاب مقدس میں لکھا ہے "چلو ہم دو تو چلیں"۔

اتنے میں خدا ذرا چُپ سا ہو گیا اور نوح کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

نوح نے کہا۔ تب تو آپ بھی ایکبار خاموش ہو گئے کبھی کچھ کہتے ہیں۔ میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کتاب مقدس ایک ایسی کتاب ہے جو زندگی کے متعلق ساری حقیقت بتاتی ہے۔ مگر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ تم جیسا خدا بڑا ہی مذبذب ہے۔ اور معمولی انسان سے

کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

خدا نے بڑی سرگرمی سے کہا مجبوراً ایسا ہونا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ یہ کائنات کس طرح سے ظہور میں آتی۔ آخر آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کس قدر پیچیدہ اور حیرت انگیز کام ہے۔ اب کچھ کچھ ہم دونوں کو پتہ لگنے لگا ہے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ جس وقت یہ دُنیا خلق کی گئی اور حرکت میں آئی ساتھ ہی ساتھ سب ہی گزرا ہوا زمانہ بھی وجود میں آگیا۔ اور ظاہر ہی ہے کہ ایک لامحدود مستقبل بھی ساتھ ہی پیدا ہو گیا۔ بھلا پھر یہ عالمِ وجود عدم میں کس طرح جا سکتا ہے؟ میں نے چار ہزار چار سال قبل از مسیح اِس دنیا کو بنایا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایسا کیا۔ ابھی تھوڑا عرصہ گذرا کہ اسی کمرے میں آپ کے سامنے میں نے اُسے معدوم کیا۔ آپ کو معلوم تک نہ ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ کائنات ازلی اور ابدی ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ نہ ختم ہونے والی تاریخ ایک نہ ختم ہونے والی کتاب میں لکھی گئی ہو۔ آپ اِس کتاب کو کہیں سے کھولیں یا کہیں سے بند کر دیں ایک ہی معنے ہوئے۔ وہ تو ویسی کی ویسی ہی رہے گی۔ یہی حال اِس عالمِ وجود کا ہے۔ یہ لامتناہی ہے اور میں خود اِس میں لپٹا ہوا ہوں۔ ہاں میرا اپنے سایہ سے جھگڑا لگا ہی رہتا ہے۔ میں آدم یعنی عالمِ انسانی کو اپنی قربت کا شرف بخشنا چاہتا ہوں۔ اور یہ ایک قدیم مسئلہ ہے۔ میرا مقصد یہاں آپ کے پاس آنے کا یہی تھا۔

نوح ابنِ لمک نے کہا۔ آپ نے بہت اچھا کیا۔ بات تو یہ ہے کہ آپ نے اِس دنیا کو بنا دیا اب کیا کریں گے؟ مانا کہ آپ خالق ہیں اور علّتِ اولیہ بھی ہیں اور آپ نے خوب بنایا۔ اور کون اس کام کو کر سکتا تھا اور آپ کے بغیر اور دوسرا ہے ہی کون

خلق کرنا۔ سوال یہ ہے کہ جب آپ یہ سب کچھ بنا چکے اور سب کائنات حرکت میں آ گئی تو پھر آپ کی مداخلت کی وجہ سے کونسی بہتری کی صورت پیدا ہوئی؟ کتاب مقدس تو آخر کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتی۔ اور ناکام ثابت ہوتی ہے۔ اور آپ کا بھی یہی حال ہے مثلاً یوحنا کے خط اور یہودہ کے خط دیکھئے۔ سلام اور دعا کے بعد لکھتے ہیں کہ ہم آ رہے ہیں اور تمہیں ضروری باتوں سے مطلع کریں گے۔ مگر ہونا ہوا تا کچھ نہیں اور مکاشفہ لکھنے والے کی دماغی حالت نہ معلوم کیسی تھی اور پھر ساڑھے اٹھارہ سو برس سے آپ نے کوئی کلام بھی نازل نہیں کیا۔ اب آپ تشریف لائے اور فرماتے ہیں کہ چلو ایک نئی کشتی تیار کرائیں۔ مانا کہ سب جگہ گرجا گھر بن گئے اور آپ کے مناد منادی میں مشغول ہیں۔ لوگ دعا کرتے ہیں اور گیت گاتے ہیں۔ مگر آپ خود اتنی مدت کہاں رہے؟ بہت سے کیتھولک تو یہ کہتے ہیں کہ گرجا گھر اور رسومات وغیرہ اصلی دین ہیں اور خدا اور اس کی مقدس کتاب فروعی اشیا ہیں اور عیسائیوں کا ایک فرقہ تو نہ خدا سے ڈرتا ہے اور نہ شیطان سے۔ آپ تو اب بوڑھے ہوتے جاتے ہیں اور آپ کی ہستی نہ ہونے کے برابر ہے۔ آپ کا سایہ بھی آہستہ آہستہ نابود ہوتا جاتا ہے بغرض خدا اور شیطان دونوں مضمحل ہوتے جاتے ہیں۔ اور نزدیک ہیں کہ بالکل معدوم ہو جائیں۔

خدا نے کچھ جھنجلا کر کہا کہ بہت خوب! جوں جوں انسان ذرا زور پکڑتا ہے اور سمجھدار ہوتا جاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اسکا سایہ نمودار ہوتا جاتا ہے۔

نوح کہنے لگا خوب کہی۔

Mass [1] Jesuists [2]

خدا نے کہا سچ تو ہے ہی شیطان اور میں تو عالمِ انسانی کے اندر رہ کر اپنا کام کر چکے اور میں تو بس اب نام کا ہی خدا رہ گیا ہوں۔ اب نیکی اور بدی۔ روشنی اور تاریکی کی جنگ بنی آدم یعنی انسانوں کے اندر شروع ہو گئی ہے۔ گویا وہی پرانی کہانی دُہرائی جا رہی ہے۔ ہاں ذرا مختلف طریقہ ہے۔ آپ جانتے ہیں خفا ہوں مگر میں عین موقع پر آپ کے پاس آیا ہوں۔ کیونکہ آپ ہار چکے تھے اور مایوس ہو گئے تھے۔ میں ایک نئے خیال کو لے کر حاضر ہُوا ہوں۔ آپ نے اُس خیال کی مخالفت بھی کی اور تنقید بھی کی۔ مگر آخر یہ کشتی تیار کرنے کا خیال آپ کو پسند آیا۔ اب آپ مجھ سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں۔ ذرا سوچئے اُس کشتی کے بنانے میں میری بات کو بھی سُننئے گا۔ آؤ مِل کر اس کام کو انجام دیں۔

نوح لمک نے کہا۔ اچھا میں بابل والا قصہ جانے دیتا ہوں اور جو نوح کا حال ہُوا اُسے بھی بھولا جاتا ہوں۔

خدا نے کہا کہ گذشتہ را صلوات۔ آپ سب کچھ بھول جایئے۔ ہاں اُن سبقوں کو نہ بھُولیئے جو میں نے آپ کو سکھلائے تھے۔ انسانوں کو متحد ہو جانے دو۔ اب وہ تباہی اور بربادی ہونے نہ پائے۔ آؤ سچے دِل سے مِل کر زندگی کا نیا ورق اُلٹیں۔

نوح بیچارا چُپ سا ہو گیا۔

خدا نے کہا۔ ذرا سوچئے۔ خدا اور شیطان کے بغیر آپ کس طرح گذارہ کر سکتے ہیں۔ جنگ اور جدال کا طوفان مچا ہُوا ہے۔ بچاؤ کی صورت کیا ہے؟ انسانوں کو کس طرح اِس بات سے روکا جائے۔ اِس سوال کو تو جانے دیجیے کہ میں خفیف

ہیں کیا ہوں ۔ مگر اِس بات کا خیال کیجئے کہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ اکثر لوگوں نے "خدا قادرِ مطلق"۔ "ہمارا آسمانی باپ" اور ہمارا ابدی دوست وغیرہ اصطلاحیں سُن رکھی ہیں۔ مگر آپ کو کون جانتا ہے؟ یہ لوگ کیا جانیں کہ مَیں نے کیا کچھ کیا اور مَیں کون تھا۔ وہ کتاب مقدس کو آپ کی طرح میرے مُنہ پر نہیں پھینکتے۔ اُنکا اُس کتاب پر ایمان بھی ایسا مضبوط نہیں جیسا آپ کا ہے۔ وہ تو اسے ایک قصہ کہانی خیال کرتے ہیں۔ وہ تو اِس بات کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ ڈیل مچھلی یونس کو نگل گئی۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ چمچ رکابی کو لے بھاگا۔ مگر وہ یہ مانتے ہیں کہ ہمارا آسمانی باپ ہے جس کی مرضی اِس جہان میں کارفرما ہے۔ اُنہیں سو برس سے مَیں نے اپنی تثلیث نئے انداز میں اُن پر ظاہر کی ہے۔ اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نیکی اور انصاف کا سرچشمہ دراصل مَیں ہوں۔ ہزاروں اور لاکھوں راستباز میرے نام کا سہارا لیتے ہیں۔ اور اس کے آسرے پر اُنہوں نے دنیا سے خرابیاں اور ظلم دُور کئے اور سختیاں سہتے رہے۔ ممکن ہے کہ دین کے نام پر لوگوں نے لُوٹ مار کی ہو اور ظلم روا رکھا ہو۔ مگر مَیں ہی تو پیغمبروں اور مصلحوں کی پُشت و پناہ ہوں۔ مجھے آپ بالکل نظرانداز نہ کیجئے۔

نوح لمک نے کہا کہ آپ گھبرائیے نہیں۔ مجھے دُکھ ہوتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ مَیں نے آپ سے سخت کلامی کی۔ مگر مَیں تو بات کو سمجھنا چاہتا تھا۔ تاکہ معاملہ صاف ہو جائے۔ آؤ مِل کر کام کریں۔ دنیا پر جو یہ مصیبت آئی ہے۔ اس کا اصلی سبب کیا ہے؟ کیوں یہ جنگ عظیم ہو رہی ہے؟ اور اس فتنۂ ظلم کی کیا وجہ ہے؟ جو کشتی ہم تیار کرانے والے ہیں وہ کیسی ہو۔ ممکن ہے اُس پر سوار ہو کر

کوہ ارارا ٹنگ جا پہنچیں۔ اور پھر شنار میں جا بسیں اور بنی نوع انسان متحد ہو کر نئے سرے سے متمدن ہو جائیں۔

دوسرا باب

نئی کشتی پر نیلے نشان

نوح لمک گہری مگر خوشگوار نیند سے جاگا۔ ابھی بستر پر ہی تھا کہ کمرے میں دھوپ آ گئی۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے کوئی خواب دیکھا ہو کسی نے کیا ہی خوب کہا ہے کہ ہر روز دُنیا نئی بنتی ہے۔ اُسے یاد نہ آتا تھا کہ یہ کس کا قول ہے۔ مگر جاگنے پر اُسے اِن لفظوں نے بڑی تسکین دی۔ اُسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ وہ کب سویا۔ تھوڑے عرصہ بعد اُسے یاد آیا کہ ایک عجیب سا بوڑھا شریف آدمی اُس سے ملنے آیا تھا۔ جس کے بال بالکل سفید اور گھنگھریالے تھے اور وہ شخص اپنے آپ کو خدا قادرِ مطلق سمجھے بیٹھا تھا۔

نوح لمک نے اپنی گھڑی میز پر سے اُٹھائی۔ اور دیکھا کہ اڑھائی بج گئے ہیں۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ خادمہ آ گئی اور کہنے لگی جناب آپ تو گھنٹے سو گئے امید ہے کہ آپ اچھی طرح سے ہوں گے۔ چائے کا پیالہ حاضر ہے۔ آپ بستر میں ہی

کچھ دیر رہیے گا یا اُٹھنے کا ارادہ ہے؟

نوح ملک نے کہا میں اُٹھ رہا ہوں۔ مگر یہ تو بتلاؤ کہ ہوا کیا؟ مجھے تو بالکل یاد نہیں کہ میں کب بستر پہ لیٹا۔

جنابِ عالی ڈاکٹر برچٹ[1] اور دو صاحبان اور پاگل خانے سے آئے تھے۔ اُنہوں نے آپ کو بستر پہ لٹایا۔ اور کہہ گئے تھے کہ جیگا نامت۔

مگر میبل[2] یہ سب کچھ کیسے ہوا۔

اصل میں تو آپ کو اُس بوڑھے شریف آدمی نے سُلا دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو خدا قادرِ مطلق کہتا تھا۔ جب وہ نیچے آیا تو بالکل سنجیدہ اور خاموش تھا اور کہنے لگا میں نے اُن کو سلا دیا ہے۔ انہیں نیند کی بڑی ضرورت تھی۔ اُن کا دماغ تھک گیا تھا اور سو جانے سے اُن کی طبیعت اچھی ہو جائے گی۔

اچھا اُس بوڑھے شریف آدمی نے ایسا کہا تھا!

میبل نے کہا کہ یہ بات اُس نے ایسے ڈھب سے کہی کہ اِس میں کسی کو شک کا موقع نہ رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شخص ایک ڈاکٹر ہو یا کوئی سُلا دینے[3] والا ہو۔ وہ شخص کچھ دیر باغیچہ کو دیکھتا رہا اور کہنے لگا۔ شام کے وقت یہ خوشگوار سردی مجھے اچھی لگتی ہے۔

اتنے میں ڈاکٹر برچٹ اور دو صاحبان اور پاگل خانے سے ایک موٹر میں بیٹھ کر آ پہنچے۔

یہ شخص میری پُشت پہ دہلیز پہ کھڑا تھا۔ میں دروازے کے پاس کھڑی

---

[1] Burchet [2] Mabel [3] Hypnotist

تھی اور پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو موٹر سے اُترتے دیکھا۔ میں نے اُس شخص کو جو میرے پاس ہی کھڑا تھا یہ کہتے سُنا "مجھے نہیں چاہیئے ...." "مجھے نہیں چاہیئے ...."۔ مگر وہ لوگ اُس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ وہ شخص کہاں ہے؟

میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ لوگ مجھے کیوں ایسا بیہودہ سوال کرتے ہیں؟ میں نے پلٹ کر جو دیکھا تو وہ شخص غائب ہو گیا تھا۔ وہاں نہ تھا۔

ڈاکٹر سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ اے لڑکی جواب کیوں نہیں دیتی۔ وہ شخص کہاں ہے؟

میں نے کہا۔ ابھی تو وہ یہاں ہی دروازہ کے پاس تھا!

ڈاکٹر اور اُس کے دو ساتھی بغیر کچھ کہے مکان کے اندر گھس گئے۔ اُنہوں نے پہلے دروازے کے پیچھے اِدھر اُدھر دیکھا جہاں چھتریاں رکھی تھیں۔ اُن کے پیچھے دیکھا۔ اُنہوں نے اسباب کے کمرے اور گول کمرے کو چھان مارا۔ وہ شخص کہیں بھی نہ تھا۔ غرض سب جگہ دیکھا بھالا کہیں نہ ملا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ میں نے کہا کہ ابھی پانچ منٹ ہوتے وہ شخص یہیں تھا۔ میں نے تو پہلے کبھی ایسا سیدھا سادھا اور شریف پاگل نہیں دیکھا۔ اُسی نے مجھے کہا تھا کہ نوح لمک صاحب اوپر پڑے سو رہے ہیں۔

ڈاکٹر سپرنٹنڈنٹ کے ساتھیوں میں سے ایک باغیچہ میں گیا اور دوسرا باورچی خانے میں اور میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اوپر گئی۔ مجھے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ

آپ آرام سے بڑی کرسی پر سو رہے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ پہلے سے
بشاش تر اور جوان تر ہیں۔ جنابِ عالی! سچ جانیئے آپ اس طرح سو رہے تھے جیسے
ایک ننھا بچہ سوتا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے آپ کی پیشانی پر ہاتھ لگایا۔ پھر آپ کی نبض
دیکھی اور آپ کے سانس کا معائنہ کیا اور کہنے لگے۔ صاحب سو رہے ہیں۔ میں نے
ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ جگا دوں۔ انہوں نے کہا کچھ ضرورت نہیں۔ مگر وہ شخص
اُنہیں کہیں نہ ملا۔ معلوم ہوتا ہے اُس کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ اور ملے گا
بھی نہیں۔ بیچارا بالکل بے ضرر شخص تھا اور مظلوم معلوم ہوتا تھا۔ ایسے شخص کو پاگل خانے
میں بند کرنے سے کیا حاصل؟ وہ تو وہاں جانا نہیں چاہتا اور اس سے زیادہ
پاگل ویسے کھلے پھرتے ہیں۔

نوحِ لمک نے خادمہ سے پوچھا کہ وہ شخص کتنے گھنٹے مجھ سے بات چیت
کرتا رہا اور کب نیچے چلا گیا؟

خادمہ نے کہا شاید ½ ۱ گھنٹہ بات چیت ہوتی رہی۔ میں نے سُنا تو کچھ نہیں
مگر میں تھی نزدیک ہی۔ آپ بڑے آہستہ آہستہ اور آرام سے باتیں کر رہے تھے۔

نوحِ لمک سوچ میں پڑ گیا!

خادمہ کہنے لگی کہ کیا وہ شخص آپ کو پاگل دکھائی دیتا تھا؟

نوحِ لمک ذرا مسکرایا۔ مگر اُس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور کہنے لگا
میرا ہلکا خاکی سُوٹ[1] نکال دینا۔ میں اُسے پہنوں گا۔ باہر نکال کر رکھو اور غسل کا
سامان تیار کرو۔ میں دوپہر کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔ ٹھیک چار بجے اور دو اُبلے

---

1. Suit

ہوئے انڈے اور دو گرم گرم مکھن ٹوسٹ[1] میرے لئے لاتا۔
خادم نے کہا۔ چائے کے ساتھ کیک[2] بھی ہے۔
نوحِ لمک نے کہا کہ اچھا تو گرم گرم کیک پہ بہت سا مکھن لگا کر لے آنا۔

(۳)

اِس واقعہ کے بعد ایک ہفتہ گذر گیا اور نوحِ لمک اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا جلدی جلدی مگر بڑے اطمینان سے کچھ لکھ رہا تھا۔ اب اُسے کچھ حوصلہ سا ہو گیا تھا اور عبارت جو زیرِ تحریر تھی نہایت ہی سلیس تھی اور وہ اُسے اور بھی سلیس بنا رہا تھا۔

اِتنے میں جو کرسی ملاقاتیوں کیلئے رکھی تھی۔ اُس پر کسی کے بیٹھنے کی آواز سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھاری جسم والا شخص اُس پر آ بیٹھا ہے۔ عبارت کو ختم کرتے ہی نوحِ لمک نے کہا مجھے معلوم تھا کہ آپ پھر تشریف لائیں گے۔ جیسے ہی اُس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہی مشفق شفیق آسمانی دوست سنجیدگی سے آکر وہاں بیٹھ گیا۔ آں حضرت کی نظر اُن اوراق پہ پڑی جو زیرِ تحریر تھے۔ کہنے لگے معلوم ہوتا ہے آپ بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔

نوحِ لمک نے کہا فی الحال تو مقصد اور ذرائع کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ آپ کہیں تو پڑھ کر سناؤں۔ بتائیے تو آپ اِتنے دن کہاں رہے؟

بوڑھے شریف آدمی نے کہا میں تو اِدھر اُدھر گھومتا رہا تھا اور ایسی چیزوں کی تلاش میں لگا رہا جو کارآمد ہوں۔

---

[1] Toast [2] Cake

نوح لمک نے کہا کہ آپ کا سایہ تو آپ کے ساتھ ہی ہوگا۔

جی ہاں۔ بھلا وہ مجھ سے جدا کہاں ہو سکتا ہے ؟

نوح لمک نے کہا کہ نکتہ چینی تو ضرور کرتا ہوگا اور آپ کو شک میں ڈال دیتا ہوگا۔

بوڑھا شریف آدمی کہنے لگا۔ اور اُس کا کام ہی کیا ہے ؟

نوح لمک نے کہا کہ اگر یہی حال رہا تو بس آپ تو صرف ایک چمکتی ہوئی روشنی ہی رہ جائیں گے۔

بوڑھے شریف آدمی نے کہا کہ میں تو اُسے بہت کہتا ہوں کہ تم شیطان، ہو۔ میرے پیچھے مت آؤ۔ چلے جاؤ۔ اور میں اُس سے بھاگتا بھی ہوں۔ مگر وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ جہاں میں جاتا ہوں وہیں آن موجود ہوتا ہے۔ کس طرح اُس سے پیچھا چھوٹے ؟

نوح لمک یہ بات سن کر خوب ہنسا۔ اُسے خیال آیا کہ یہ سفید بالوں اور لمبی ڈاڑھی والا بیچارہ بہت کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح سایہ اُسے چھوڑ دے اور اُسے جس طرح انسان پاؤں سے جرابیں نکال پھینکتا ہے نکال کر دُور کرے۔ مگر اُس کا کچھ بس نہیں چلتا۔ چنانچہ نوح نے خوب قہقہہ لگایا اور پھر اُس ملاقاتی کی طرف دیکھنے لگا اور کہنے لگا۔

جناب عالی! کتاب مقدس ساری پڑھ ڈالئے کہیں بھی آپ یا شیطان ہنستے ہوئے نظر نہیں آتے! کم از کم میری نظر سے تو یہ بات نہیں گذری۔

وہ شخص کہنے لگا۔ یہ تو درست ہے۔ مجھے بھی ایسا ہی خیال ہے۔ مگر یہ تو

کہیئے کہ ہم ہنسیں کیوں؟

نوح نے کہا۔ شروع سے آخر تک سنجیدہ رہنے کے کیا معنی؟ اسی لئے تو موجودہ زمانے کا انسان آپ پر سبقت لے جاتا ہے۔ وہ خوب ہنستا ہے۔ اس طرح سب بیہودگی نمائش ہو جاتی ہے۔ ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ خوب ہنسنا چاہیئے۔ اس طوفانِ بدتمیزی پہ بھی اور جو بعد میں ہونے والا ہے اُس پہ بھی۔ اِس قدر تباہی اور خونریزی پہ بھی! ہیبت ناک واقعات پہ بھی ہنس دینا چاہیئے۔ ہے تو یہ سب بیہودگی ہی! سچ پوچھو تو دن نکلتے ہی یہ بیہودگی شروع ہو جاتی ہے۔ زندگی کیا ہے سراسر بیہودگی ہے۔ پہلے زمانے تو اب گزر چکے۔ مگر فی زمانہ تو ہم برجِ[1] کو بنانے ہی چلے جا رہے ہیں اور بالکل نہیں رُکتے یا جھجکتے۔

یہ بات اُس شخص کی کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ اُس نے ویسے ہی سر ہلا دیا اور کہنے لگا۔ یہ جو آپ یادداشت تحریر فرما رہے ہیں مجھے ذرا اُس کے متعلق بتایئے۔

(۱۷)

چنانچہ نوح ملک ایک تحکمانہ لہجہ میں پڑھنے لگا۔

"سب سے پہلے ہمیں صحیح طور پر یہ سوچنا ہے کہ ہمیں کن کن اشیا کو بچانا ہے۔ دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ کس آفت سے اُن چیزوں کو بچانا ہے۔ یہ بعد میں فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہ دو باتیں طے ہو جائیں تو پھر یہ سوچیں کہ کشتی کس طرح کی ہو۔ البتہ وہ کشتی چھوٹی سی۔ خوبصورت اور مضبوط ہونی چاہیئے تاکہ

---

[1] بابل کی طرف اشارہ ہے۔ Babel

طوفان میں محفوظ رہے۔ اس میں سوار ہو کر ہم سب ارارات کو چل دیں گے۔ اور پچھلی ملاقات میں آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ وہاں تک ہی نہیں پہنچنا۔ ہم کو تو اس خوشگوار پہاڑ پر اُترنے کے بعد کمانوں کا تماشہ دیکھنا ہے۔

خدا نے ذرا سر ہلایا۔

اُس کے بعد بابل والا معاملہ پیش آتا ہے۔ کشتی تو تب ہی بنائیں جب یہ سب باتیں طے ہو جائیں۔ آپ اس بات پہ متفق ہیں یا نہیں؟

خدا نے کہا۔ بالکل درست ہے۔ میری تحقیقات ......

نوح لمک نے بات کو کاٹ کر کہا۔ معاف کیجئے۔ مجھے یہ تحریری یادداشت پڑھ لینے دیجئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آیا کن اشیا کو بچا کر کشتی میں رکھنا ہے؟ کیا یہ طے ہو گیا ہے؟ پرانی دُنیا میں جو یہ جنگ و جدال۔ نفرت اور مظالم ہو رہے ہیں بھلا ان کو بچانے کی کیا ضرورت؟ ہمارا اِس دُنیا سے اب کیا واسطہ؟ کیوں ٹھیک ہے یا نہیں؟ کشتی میں اور چیزیں رکھیں۔ مگر اِس تباہی کے بیج اور نمونے بچا کر رکھنے سے کیا فائدہ؟ ایسا کرنے سے تو پھر وہی تباہی اور بربادی شروع ہو جائے گی۔

خدا نے کہا۔ میرے خیال میں جو سب سے عمدہ چیزیں ہیں وہ بچا لینی چاہئیں۔

نوح لمک نے کہا وہ عمدہ چیزیں کونسی ہیں؟

خدا نے کہا کہ پہلے میں بتاؤں کہ میں نے کیا تحقیق کیا ہے؟ پھر دیکھیں گے۔

نوح لمک نے کہا فرمائیے۔

خدا نے کہا۔ آپ کی تصنیفات مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ آپ کا خیال ہے کہ ایک خول (Cocoon) یا بوتل جیسی چیز لے لی جائے۔ اور اُس میں سب قسم کے

علوم اور ایجادات اور معلومات وغیرہ بھر دی جائیں اور جب یہ جنگ۔ تباہی۔ بدنظمی۔ قحط سالی اور وبا وغیرہ ختم ہوجائیں تو نئے سرے سے ایک نئی دنیا یا نیا نظامِ عالم طیار ہو۔ یہ سب باتیں آپ کی کتاب "وقت[1] کی کل" میں موجود ہیں۔

نوح نے کہا کہ میں نے کبھی کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی۔

خدا نے کہا کہ اب آپ چھپاتے کیوں ہیں؟ آپ کی کتابیں مثلاً "عالم انسانی[2] کا کام اور دولت اور خوشی" یا "عالمگیر دماغ[3]" وغیرہ کیا کہتی ہیں اور جوں جوں آپ بڑے ہوتے جاتے ہیں آپ کا یہ خیال تقویت ہی پکڑتا جاتا ہے اور آپ اسے بار بار دُہراتے ہیں۔

نوح نے کہا۔ میں نے ہرگز یہ کتابیں نہیں لکھیں۔

خدا نے کہا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ بیکن[4] نے ملکہ الزبتھ[5] کے زمانے میں کتابیں لکھیں اور ڈانلے[6] نے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچا دی کہ مصنف وہی تھا۔ میرا تو یہی خیال ہے کہ پچھلے سو سال میں جو بھی کتاب آپ نے لکھی وہ اسی مضمون پر تھی کہ نیا نظامِ عالم کس طرح قائم ہو۔ آپ کے علم میں یہ بات نہ ہو۔ مگر ہے یہ حقیقت۔ کتابوں کے نام اور رکھ لئے اور اگر یہ بھی لکھی ہوں تو بھی آپ کا خیال تو اسی طرف لگا رہتا ہے۔ کتابیں تو اتنی ہیں کہ کس کس مصنف کا نام لیا جائے۔ بھلا میں کس طرح کتاب مقدس پر نکتہ چینی برداشت کر سکتا ہوں؟ میں ایسے مصنفوں کو بغیر کچھ کہے کیسے چھوڑ دوں؟ اول تو کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ کتاب

---

[1] "Time Machine" [2] "Work, Wealth & Happiness of Human kind" [3] World Brain [4] Bacon [5] Elizabeth [6] Donnelly

مقدس ہر لحاظ سے دیگر کتب پر برتری رکھتی ہے۔ خدا مصنف ہونے کی حیثیت میں اپنی خفگی کا اظہار کرنے میں حق بجانب تھا۔

نوح نے کہا۔ میں تو آپ کا مقابلہ کرنا نہیں چاہتا۔

خدا نے کہا۔ آپ کہتے ہیں۔ کتابِ مقدس پر تفسیریں اور تنقیدیں اور تبصرے اور اخباروں میں مضامین ہزاروں موجود ہیں اور بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں جن میں ایک حرف بھی اُس کتاب کے برخلاف نہیں لکھا گیا۔ بلکہ پروفیسر ہکسلی[1] نے تو اُس کی بڑی تعریف کی ہے۔ صدیوں سے ادبی لحاظ سے کتاب مقدس عجوبۂ روزگار رہی ہے۔ مسکینوں کے لئے ایک خزانہ اور امیروں کے لئے سہارے کا کام دیتی رہی ہے۔ خواہ لوگ جنگل بیابان میں رہتے ہوں۔ مگر اسی کتاب مقدس کو منگاتے ہیں۔ پھر بھی آپ آج کل کی ردی کتابوں کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔

نوح نے کہا کہ یہ بحث تو آپ نے چھیڑی تھی۔

خدا نے کہا کہ کیوں نہ چھیڑتا؟

نوح نے کہا۔ میں نے تو صرف یہی کہا تھا کہ یہ کتابیں میں نے نہیں لکھیں۔

خدا نے کہا۔ میں کہتا ہوں کہ آپ نے لکھی ہیں۔

نوح نے کہا کہ اِس بات کو جانے دیجئے۔

خدا جو ابھی تک کچھ گھبرایا ہوا تھا کہنے لگا اچھا جانے دیجئے۔

نوح نے کہا اچھا بتایئے آپ نے کیا کچھ دریافت کیا ہے؟ میں آپ کے ساتھ متفق ہوں۔ کتاب مقدس ایک بنیادی اور اصولی کتاب ہے۔ باقی ادبی کتابیں

---

[1] Prof. Huxley

اُس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

یہ سن کر بوڑھے شریف آدمی کی گھبراہٹ جاتی رہی اور وہ کہنے لگا میں نے ایک عجیب بات دریافت کی ہے۔ کیا آپ نے فلموں کے متعلق کچھ سنا ہے؟

نوح جانتا تو تھا ہی۔ مگر پھر بھی متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔ یہ خدا بھی خوب مزیدار ہے۔ ایک تو اپنی خلقت میں لپٹا ہوا ہے۔ اور اب نوح سے ہمکلام بھی ہو رہا ہے۔ نوح اب سمجھا کہ خدا سچ مچ ہی ایک خالق ہے اور لوگ سب اُسے اِس عالم کا بنانے والا مانتے ہیں اور نوح مصنّف ہونے کی حیثیت سے ایک طرح سے خیالات کا خالق بھی تھا اور وہ اِس بات پر فخر کیا کرتا تھا کہ دراصل یہ دو مصنفوں کی باہمی ملاقات ہے۔ ایک مصنّف دوسرے مصنّف کی باتیں اکثر چرا لیا کرتا ہے۔ اِس میں بحث مباحثہ کی کیا ضرورت ہے؟ اگر خدا نوح کو موجودہ زمانے کی دہشت پسند ادبی کتابوں کا مصنّف جانتا تھا تو اِس میں کونسی حیرانی کی بات ہو گئی؟ اور اگر اُس نے فلم کی حقیقت کو معلوم کر لیا تو بہت اچھا کیا۔

خدا نے کہا کہ یہ تحقیق ہو گیا ہے کہ فی زمانہ فلمیں تیار ہو سکتی ہیں اور اُن کی کئی کاپیاں لی جا سکتی ہیں اور ہر جگہ روانہ کی جا سکتی ہیں۔ اور دنیا کے کسی حصہ میں لے جا کر دکھلائی جا سکتی ہیں اور خرچ بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ ایک جنگی جہاز بنانے میں لاکھوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ سب دنیا کی تصویریں اور عمارتیں اور آثارِ قدیمہ ہر جگہ فلم کے اندر بند کئے جا سکتے ہیں۔ ہر قسم کے قدرتی منظر اور دلفریب نظارے فلم کے اندر آ سکتے ہیں۔ پودوں کا اُگنا اور جانوروں کی حرکات

ف Films

وغیرہ عین اصلی حالت میں دکھلائی دینے لگتی ہیں۔ دنیا کی قدیم کتابوں کا عکس لیا جا سکتا ہے اور انہیں ایک کمرے میں جمع کیا جا سکتا ہے۔ روما کے پوپ کی لائبریری[1] اور انگلستان کی بڑی بڑی لائبریریاں اور امریکہ میں کانگرس کی لائبریری جو شہر واشنگٹن[2] میں ہے۔ یہ سب میلوں جگہ گھیرے ہوئی ہیں۔ اور ان میں بیشمار کتابیں ہیں جن کی فہرست تیار کرنی ناممکن ہے۔ شاید چند سالوں میں جرمن ان لائبریریوں کو تباہ کر دیں۔ مگر اب تو سب علوم فلم کے اندر بند کئے جا سکتے ہیں۔ کس قدر آسانی ہو گئی ہے۔ میں ایک دن ڈاکٹر کینتھ میس[3] کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ امریکن کوڈک[4] کمپنی کے مالک ہیں۔ جب میں نے اپنا کارڈ[5] بھیجا تو وہ ذرا حیران سے ہوئے۔ مگر انہوں نے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ اور میں نے بھی ایک دو معجزے دکھلا کر انہیں اپنے متعلق یقین دلا دیا۔ جو کچھ انہوں نے فلم کے متعلق مجھے بتلایا وہ تو بہت ہی اطمینان بخش تھا۔ یہاں تک کہ میرا سایہ بھی خوش ہوا۔

نوح نے پوچھا کہ وہ حضرت بھی آپ کے ساتھ تھے؟

خدا نے کہا سایہ کہنے لگا کہ میں بھی چلوں گا۔ اسے اس قسم کی کلیں دیکھنے کا بہت شوق ہے اور وہ خوب سمجھتا بھی ہے۔

نوح کہنے لگا۔ بھلا وہ نہ سمجھے! جتنے جانور آپ نے بنائے ہیں وہ ان سب سے زیادہ ہوشیار ہے۔

خدا نے کہا۔ الغرض فلم ایک قابل عمل شئے ہے اور بڑی معقول ہے اس

---

[1] Library [2] Washington [3] Kenneth Mees

[4] Kodak [5] Card

کے ذریعہ ہم سب کائنات کا نقشہ اُتار سکتے ہیں۔ اور اُسے سب جگہ یا کُلّی یا جُزو جُزو کر کے دکھلا سکتے ہیں۔ اُس کو کہیں چھپا کر رکھ لو۔ اگر ساری دُنیا لڑائی میں مر جائے ہمارے پاس تو یہ پوری کی پوری فلم موجود ہوگی۔ جب جی چاہے گا نکال لیں گے۔ کشتی بنانے کا یہی تو مقصد ہے۔ اب تو صرف روپیہ چاہیئے اور کچھ لوگ مدد کریں تو کام چل جائے۔

خدا اِس قدر مطمئن القلب تھا کہ نوح نے کچھ کہنا مناسب خیال نہ کیا۔ تب خدا کہنے لگا کہ موجودہ زمانے میں ایک بات تو قابلِ تعریف ہے اور وہ یہ ہے کہ پرانے طریقے بڑے ہی بھدّے اور پیچیدہ تھے اور اب تو سب کام بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ مثلاً پرانے وقتوں میں کلامِ الٰہی پیغمبروں پر نازل ہؤا کرتا تھا اور بعض دفعہ عجیب طریقے استعمال کئے جاتے تھے۔ اب کیا ہے دن ہو یا رات پیغمبر کو ٹیلیفون[1] پر بلا لیا اور جو کچھ کہنا ہؤا سو کہہ دیا۔ خیر کشتی کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اب تو سوال یہ ہے کہ وہ کس طرح تیار ہو؟

نوح نے آہستہ سے کہا اچھی بات۔

اِتنے میں خدا کا چہرہ مُرجھا سا گیا۔ اور کہنے لگا۔ اچھا۔

نُوح بھی چُپ سا ہو گیا۔

خدا نے کہا کبھی کبھی آپ مخالفت کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ضد بھی کر بیٹھتے ہیں اور تنقیدی رنگ میں بات چیت کرتے ہیں۔ مجھے بڑا ہی بُرا لگتا ہے اور مجھے شیطان یاد آجاتا ہے۔ خاص کر جب وہ کسی بیہودہ بات پر اڑ جاتا ہے۔ ہم دونوں

---

[1] Telephone

ہی کو نو مِل کر یہ کام چلاتا ہے۔

چنانچہ خدا غضب ناک ہو گیا۔ اور نوح سے کہنے لگا۔ کہو اب کیا کہتے ہو؟

نوح نے کہا کہ شیطان کا کام تو میں کرنے سے رہا!

خدا نے کہا کہ مجھے تو ڈر ہے کہ آپ بھی کہیں شیطان کی طرح غرور کا شکار نہ ہو جائیں؟

نوح نے کہا "غرور کا شکار!"

خدا نے کہا کہ کیا آپ میری مخالفت پر آمادہ نہیں ہو سکتے؟

نوح کہنے لگا۔ اگر ہم دونوں نے مل کر کام نہ کیا تو شیطان ضرور مشکلات پیدا کرے گا۔ یہ تو اُس کا کام ٹھہرا۔ وہ تو کشتی پانی میں ڈالنے سے پہلے ہی کام بگاڑ دے گا۔

خدا نے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آپ شیطان کی وکالت کر رہے ہیں۔

نوح نے کہا۔ ہے تو کچھ ایسی ہی بات۔ اجازت ہو تو کچھ تحریری یادداشت سے اور پڑھوں۔

جی ہاں پڑھیئے (خدا کے دل میں اب کوئی غصّہ نہ تھا)

تب نوح پڑھنے سے پہلے کہنے لگا۔ کہ میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ کیا پرانی دُنیا کو جب اس میں بہت سی خرابیاں آجائیں گی اور یہ دنیا گناہ آلودہ ہو جائیگی بچانا ہے یا ایک بالکل نئی دُنیا بنانی ہے اور وہ بھی اُس وقت جب کہ یہ آخری خوفناک جنگ اور قوموں کی آپس کی لڑائی اور سب پرانی روائتیں ختم ہو چکینگی؟

یعنی کیا آپ نئے خیالات کو نشر و پیج دینا ہے یا وہی پرانے دقیانوسی عیسائیوں[1] والے طریقے جاری رکھنے ہیں؟

خدا نے کہا۔ یہ تو سیاسی معاملہ ہے۔

نوح نے کہا کہ آپ کے بنائے ہوئے بڑے اور چھوٹے آسمانی صحیفے اگر سیاسی نہیں تو اور کیا ہیں؟ اچھا تو اصولی طور پر فیصلہ کر لیجئے کہ بالکل نئی دنیا بنانی ہے یا نہیں؟

خدا نے کہا پہلے یہ تو بتلاؤ کہ کس طریقے پر دنیا بنانی ہے؟

نوح نے جواب دیا کہ وہ بعد میں دیکھ لیں گے۔ سوال تو یہ ہے کہ پرانی دنیا کی تجدید کرنی ہے یا نئے سرے سے ایک نئی دُنیا بنانی ہے۔

خدا نے کہا کہ اس جنگ سے کیا مراد ہے؟

نوح نے کہا کہ جب آپ سے اس قسم کا سوال کیا جاتا ہے تو آپ ہمیشہ پیغمبروں کی طرفداری کرتے ہیں اور پادریوں اور پرانے خیال کے لوگوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ آپ بڑے ہی انقلاب پسند ہیں۔ کتاب مقدس تو ہے ہی ایسی کتاب۔ آپ مجھے خواہ مخواہ اُن لوگوں کے ساتھ شمار کر لیتے ہیں جنہوں نے "دماغ عالم[2] اور تاریخ عالم[3]" وغیرہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اُن کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے دماغوں میں یہ نیا تخیل سرایت کرے۔ جب فرانس میں انقلاب ہوا تھا تو بھی ایسا ہی کیا گیا تھا۔ تب تو یہ جادو چل گیا تھا۔ مگر ہر وقت تو ایسا نہیں ہوتا۔

---

[1] Franco, Halifax, Daladier, etc.

[2] World Brain [3] World Encyclopaedia

لوگ شاکی ہو جاتے ہیں اور کہنے لگ جاتے ہیں کہ ویلز جیسے مصنف بیٹھے ایسی
کتابیں لکھتے رہتے ہیں۔

خدا نے کہا کہ تب آپ یہ ساری دنیا کے قلم لے لینے والے خیال کو پسند
نہیں کرتے۔ گویا یہ ہماری مشکل کا حل نہ ہوا۔

نوح نے کہا پورا حل تو نہیں کچھ حد تک حل ضرور ہے۔ ایسا کرنا تو چاہیئے
مگر اس کے علاوہ اور باتیں بھی تو لازمی ہیں۔ اگر ہم نے عقل سے کام نہ لیا
تو بہت سی خرابیاں ساتھ ہو لیں گی۔ شیطان بھی ساتھ ہو لے گا۔ اس کے
تو مزے ہو جائیں گے۔ وہ سب پرانی خرابیاں جھوٹ اور فریب اور دغا بازیاں
اور دماغی بیماریاں اپنے ساتھ لے آئے گا۔ وہی بابل والا حال ہوگا۔ اگر زبانوں کا
اختلاف نہ ہوگا خیالات کا تو ہوگا۔ وہ بیچارہ آلڈس ہکسلی[1] جاکر ساری دنیا
گھوم آیا۔ آخر پاگل ہو گیا۔

خدا نے کہا آپ درست فرماتے ہیں۔ مگر آپ موجودہ علوم سے واقفیت
رکھتے ہوئے مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ ان میں کتنی سچائیاں بکھری پڑی ہیں۔
بہت سی ایجادیں ابھی نامکمل حالت میں ہیں ... مثلاً کیونڈش[2] کی ایجاد
لے لیجئے۔ مکمل ہوتے ہوتے ایک صدی گزر گئی۔

نوح سوچ میں پڑ گیا اور کہنے لگا۔ ویسے تو کوئی بات اس دنیا میں ایسی
نہ ہوگی جس کے اندر کچھ نہ کچھ سچائی نہ ہو۔ جاپان کے شنٹو[3] دھرم کو ہی لیجئے اس
میں بھی کئی باتیں ایسی ہیں جو انسانی دماغ کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور جو آگے

---

[1] Aldous Huxley [2] Cavendish [3] Shinto

چل کر بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ مہاپرشوں کی زندگیاں۔ وسطی زمانے کے افسانے اور بے شمار ناول ایسے ہیں کہ نئی دنیا کے محققین اُن میں بہت سا مصالح پائینگے بڑے شوق سے ایسی باتوں کو سجایئے۔ مگر یہ خیال رکھیئے کہ کشتی میں بوجھ زیادہ نہ ہو جائے۔ کہیں کشتی ڈوب نہ جائے۔ یہ سب کچھ بھر لو۔ مگر اُسے کشتی کے نچلے حصہ میں ڈال دیں گے۔ تاکہ ایک تو توازن قائم رہے دوسرے خوراک کا کام دے کشتی کے اوپر کے حصہ میں صاف اور ستھری چیزیں مثلاً متحدہ اور تازہ دل اور دماغ دغیرہ ہونے چاہیئں "چیدہ لوگوں کے لئے تو بالکل پاک اور نفیس اشیا ہوں اور عوام کے لئے سادہ اور مفید چیزیں ہوں"۔

(۴۷)

نوح لمک نے آخری فقرے کو ایک کاغذ پر لکھ لیا تاکہ وہ اُسے بھول نہ جائے۔ پہلے بھی وہ عموماً ڈِن صاحب (جو ایک مصنّف تھے) کی طرح ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ اب اُسے ذرا ہوش آیا۔ پہلے تو وہ تعجب سے پاس کی خالی کرسی کیطرف دیکھتا رہا۔ اور تھوڑی دیر بعد اُس نے خادمہ کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی۔

خادمہ نے کہا۔ جناب آپ خوب سوئے۔ زیادہ کام کرنے سے آپ تھک جاتے ہیں اور چونکہ دن رات فکر مند رہتے ہیں۔ سو جانے سے آپ کے دماغ کو آرام ملتا ہے۔

نوح لمک نے کہا۔ چائے کا پیالہ پی کر میں سیر کرنے جاؤنگا۔ بھلا میبل! یہ تو بتاؤ اُس بوڑھے شریف آدمی کا کچھ پتہ چلا؟

J. W. Dunn ملے

خادمہ نے کہا۔ وہ تو نہیں (لا دل میں خوش تھی) کسی نے اُسے دیکھا بھی نہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ کسی رسدگاہ[1] کو دیکھنے گیا تھا۔ اُس نے کسی سے پوچھا کہ ستاروں سے کس طرح پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں جہاز کس جگہ پہ ہے؟ لوگوں نے خیال کیا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ شخص جرمن ہوائی جہاز سے چھتری لئے[2] اُترا ہو۔ مگر یہ سب گپ معلوم ہوتی ہے۔

نوحِ ملک نے خادمہ سے پوچھا کہ تم نے یہ کہاں سے سُنا؟

کہنے لگی سر جیمز جین[3] کی خادمہ کسی سے یہ بات کہہ رہی تھی اور وہ میرے ایک دوست کو جانتی تھی، اور اُس نے اُس سے کہا تھا۔

نوحِ ملک پھر سیر کے لئے اکیلا چلا گیا اور سوچتا رہا۔

(۵)

نوحِ ملک اب اُس بوڑھے شریف آدمی کو خوب پہچان گیا تھا۔ وہ شخص پہلے تو دوسروں کو بڑے سبز باغ دکھلاتا تھا اور کہتا کہ اس طرح ہوا اور یہ ہوا اور وہ ہوا۔ نئے سرے سے کام ہو۔ مگر آخر کچھ نہ بنتا۔ سچ پوچھو تو حضرت انسان آج تک یہی کرتا رہا ہے۔ ایک کام بڑے جوش و خروش سے شروع کرتا ہے اور جسطرح کوئی شخص کوشش کر کے دلدل سے نکلے اور پھر پھسل کر اُسی میں جا گرے۔ بس اُس کا یہی حال رہتا ہے۔ خدا اور انسان اسی طرح سے پہلے تو مِل کر ایک کام کو شروع کرتے ہیں۔ مگر نہ معلوم کیا ہو جاتا ہے۔ آخر کام بگڑ ہی جاتا ہے اور تباہی آ جاتی ہے۔ وہ آغاز آخر میں ایک خوابِ خیال

---

[1] Observatory [2] Parachutist [3] Sir James Jean

سا ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم عہدِ گذشتہ سے اس طرح پیوستہ ہیں
کہ اُس سے تعلق توڑ ہی نہیں سکتے۔ ماضی سے جکڑے رہنا کوئی لازمی بات تو نہیں
اگر ہم مضبوطی سے دل میں یہ ٹھان لیں کہ نئی دنیا ایک نئے ڈھنگ سے بنا کر چھوڑیں گے
اور ایسی بنائیں گے جو صاف اور ستھری ہوگی تو یہ ناممکن تو نہیں! ابھی نوحِ لمک
یہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ وہ چونکا اور جس طرح کوئی شخص اُڑتی ہوئی
تیتری کو پکڑنے لگے وہ کہنے لگا "جانے مت دو!!"

اتنے میں خدا اِس سوال کو مختلف پہلوؤں سے جانچنے لگا۔

اِس جنگ کے دو پہلو ہیں۔ اول تو دنیا کا حال بالکل خراب اور خستہ ہو
گیا ہے۔ دوسرے بے حد تباہی اور بربادی ہو رہی ہے۔ جو لوگ اِس کشتی
میں سوار ہوں گے اُن کو غیر جانبدار رہنا ہوگا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ لوگ
جنگ میں شامل نہ ہوں۔ تباہ کرنے والوں کا مقابلہ تو ضروری ہے۔ مگر ساتھ ہی
ساتھ پہلے نظام کا بھی قلع قمع کرنا لازمی ہوگا۔ تاکہ وہ پھر سر نہ اُٹھا سکے۔

اب اِس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ قدم کو سوچ کر اُٹھانا چاہیئے!

کشتی کی تحریک مقبولِ عام نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ صاحبِ اختیار
اور قدرت والے ہیں وہ بھلا کب اِس قدرت کو پسند کریں گے؟ عوام کی سمجھ
میں یہ بات نہ آئے گی کہ نیا نظام کیسا ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے اُسے دیکھا ہی
نہیں۔ اُن کے ذہن میں اس کا تخیل آنا ہی مشکل ہے۔ اور جو لوگ عیش پرستی
میں لگے رہے ہیں وہ بھلا ایک نئی دنیا کیونکر بننے دیں گے؟ انہیں یہ کشتی والا خیال
کیونکر اچھا لگے گا؟ بلکہ وہ تو اِس کا مضحکہ اُڑائیں گے۔ اور جب تک طوفان آن

نہ پہنچیگا وہ روڑے اٹکاتے رہیں گے۔ سوال تو یہ ہے کہ کشتی میں کون لوگ سوار ہوں؟

ہاں صاحب! ذرا ٹھہریئے۔ جب آپ سو کر اُٹھے تھے تو آپ نے یہ فقرہ کہا تھا "چیدہ لوگوں کے لئے تو بالکل پاک اور نفیس اشیا ہوں اور عوام کے لئے سادہ اور مفید چیزیں ہوں"۔ کیا اس سے ہماری مشکل حل ہو جائے گی؟

اتنے میں نوح ملک سیر کرتا ہوا اُس نالے تک جا پہنچا جو آسکے باغیچہ کے بیچوں بیچ بہتا تھا۔ ایک جگہ جہاں انسان بیٹھ سکتا تھا وہ بھی بیٹھ گیا۔ خیال کیا کہ بیٹھ جانے سے سوچنے میں مدد ملے گی۔ چپکے سے بیٹھ کر اور اُنگلی اُٹھا کر اپنے آپ سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا:

دیکھو اے دُنیا کے رہنے والو! انسانی زندگی کو نئے طریقے پر چلانے کے سوال کو فی زمانہ مارکس۔ انجیل اور لینن[1] جیسے شخصوں نے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ اُنہوں نے کیا اُس کو سمجھ لینا ہمارے لئے لازمی ہے۔ تاریخ میں پہلے کبھی اس قسم کا اہم تجربہ نہیں کیا گیا۔ ایسا سمجھو کہ یہ تجربہ سب سے آخری اور ہمارے زمانہ کی روش کے مطابق ہے۔ اُن کا حل بالکل موجودہ حالات کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ مگر اُس وقت فاصلہ کا سوال تھا جو اب حل ہو گیا ہے۔ کارل مارکس شخصی حیثیت میں کیسا ہی ناتراشیدہ کیوں نہ ہو (جیسا کہ میرے بعض ہمعصروں کا خیال ہے) اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے بڑا کام کیا ہے۔ شخصی طور پر دیگر ماہرین کی طرح وہ بڑا ہی بد دماغ تھا۔ مگر ہمیں اس بات کا بھی

---

[1] Marx, Engel & Lenin

لحاظ رکھنا چاہیئے کہ اُس نے کس ماحول میں پرورش پائی؟ اُس زمانے کی بیہودگی اُس میں منعکس ہو رہی تھی۔ اُن دنوں یہ خیال لوگوں کے سر پر سوار تھا کہ بعض ہستیاں بڑی ممتاز ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ کارل مارکس کے سر پہ بھی یہ بھوت سوار ہوا۔ بیچارہ کیا کرتا!

جب یہ مضمون آرائی ہو رہی تھی تو عین اُسی وقت ایک چھوٹا سا آبی چوہا نوح لمک کے سامنے نالے کے کنارے پر آ بیٹھا۔ لگا غوطے لگانے جیسے آبی چوہے کا قاعدہ ہے۔ جب نوح لمک نے ہاتھ اُٹھایا تو وہ سمجھا کہ کوئی اور شخص بھی وہاں موجود ہے۔ چوہے نے کبھی پہلے انسان کی شکل نہ دیکھی تھی اور وہ حیرت میں تھا کہ یہ کیا بلا ہے۔ مگر وہ ڈرا بالکل نہیں۔ غوطے لگانا چھوڑ دیا اور متوجہ ہو کر بیٹھ گیا۔

نوح لمک اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

چوہا بیچارا سر کو نیچا کئے ہوئے اُس کی طرف دیکھا کیا گویا (دیکھو نوٹ[1]) کی طرح کچھ سننے کی تاک میں لگا تھا۔ یہ خیال کہ ہر شخص چاہے اُس کے سر پر ایک بڑی سی ٹوپی ہو یا نہ ہو۔ اُس کی لینینٹ پر ایک بڑا سا جُبہ ہو یا نہ ہو۔ اس کی داڑھی بڑی ہو یا چھوٹی۔ سر کے بال کچھے دار ہوں یا نہ ہوں جسم کا بھاری ہو یا ہلکا۔ کسی اہم مسئلہ کو بلا امتیاز بیان کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اُس زمانے کے لوگ اس بات کو نہ سمجھتے تھے۔ اُن کے ذہن میں یہ بات نہ آتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک نئے خیال کو پیش کرنا اور ایک ممتاز ہستی نہ ہونا اور ساتھ ہی مذکورہ بالا لوازمات سے مبرا ہونا ناممکن بات ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ انہیں اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنا

---

[1] Oliver Twist

ہی پڑتا تھا۔ مثلاً لانگ فیلو[1] ایک شاعر یوں رقمطراز ہے:۔

"ممتاز ہستیوں کے نقشِ قدم پر چل کر ہم بھی اپنی زندگی کو اعلےٰ بنا سکتے ہیں اور جب ہم ملکِ عدم کو چلے جائیں گے تو ہمارے اعمال آنے والی نسلوں کے لئے سرِ مشق بنیں گے"

مگر فی زمانہ لوگ یہ نہیں چاہتے (آپی چوہے کی طرف متوجہ ہو کر) اب لوگ انکساری اور عاجزی سے کام لیتے ہیں۔ ہم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ہمارے مرنے کے بعد ہماری یادگاریں قائم ہوں۔ ہمارے بُت بنائے جائیں اور بازاروں اور مشہور جگہوں میں نصب کئے جائیں۔ تاکہ بچے انہیں دیکھ کر خوف کھائیں نوح ابن لمک (حضرت نوح) بلاشبہ ایک ممتاز ہستی تھی۔ آخر میں اس کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ فی زمانہ بڑے بڑے سائنسدان بھی کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ کچھ عرصہ کے لئے کوئی بڑا کارِ نمایاں کیا اور پھر کام کسی دوسرے کو جو اپنے برابر یا اپنے سے بہتر ہو سونپا اور چل دیئے۔ مارکس کا بھی یہی حال تھا لڑتا جھگڑتا تھا اور اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا اور کسی کو اپنی ہمسری نہ کرنے دیتا تھا۔ اینجل جو اُس کا بڑا مداح تھا اور اُس پر برتری بھی رکھتا تھا اُس کے ساتھ ہی چپکا رہا۔ آخر اصلیت ظاہر ہو گئی جس اشتراکیت کی بنیاد انہوں نے ڈالی وہ مسئلہ بھی ایک صدی کے بعد ناقص اور نامکمل ثابت ہوا۔

آپی چوہے کو خطاب کرتے ہوئے اور ذرا جھنجھلا کر کہا

ذاتیات کو ایک طرف رکھتے ہوئے اور ان ہستیوں کے ممتاز ہونے کا بالکل

---

[1] Longfellow at Engel

خیال نہ کرتے ہوئے اُن سے پوچھنا چاہیئے کہ آخر وہ کیا کر رہے ہیں ؟ دراصل وہ اُسی) کام کو کر رہے ہیں جو خدا آغازِ خلقت سے کر رہا ہے۔ اور واقعی اس کام کو بھی (خدا کی قدرت سے مؤید ہو کر) اور اس زمانہ کے سب سمجھدار لوگوں کو ضرور کرنا ہی چاہیئے۔ سچ پوچھو تو خدا بھی انقلاب پسند ہے۔ بالشوِکی تحریک بھی تو خدا کے منشا کو ہی پورا کرتی ہے۔ قدیم زمانہ میں بھی اور اب بھی علما کا بنایا ہوا دین خدا کو ایک مُردہ لاش بنائے ہوئے تھا اور اُس خدا کی پرستش سکھلاتا تھا جو ہاتھ تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ بھلا رُوس کو خدا کا دُشمن کیوں ٹھہرایا جاتا ہے ؟ اس میں شک نہیں کہ بالشوِکی لوگ کہتے ہیں کہ مذہب عام لوگوں کے لئے ایک طرح کی افیون ہے۔ مگر اس کا اشارہ اصلی مذہب کی طرف نہیں۔ علما کے بنائے ہوئے خود ساختہ دین کی طرف ہے۔ انقلاب کے معنی تو یہ ہیں کہ خدا زندہ ہے اور مذہب والوں نے خدا کو اچار کی طرح بوتل میں بند کر رکھا ہے۔ مَیں نے پیٹروگریڈ[1] (دارالحکومت روس) میں وہ عجائب گھر دیکھا ہے جو مذہب کے برخلاف قائم کیا گیا ہے۔ وہ تو علما دین اور توہمات وغیرہ کے برخلاف ہے۔ مگر جس کو ہم خدا کہتے ہیں اُس کے خلاف بالکل نہیں۔ خدا تو ہر زمانے میں فریبیوں اور قدوسیوں اور علما دین اور بیہودہ دینی رسومات کے برخلاف جہاد کرتا رہا ہے۔ خدا تو ہے ہی انقلاب پسند اور ابد تک ایسا ہی رہے گا۔ آؤ ذرا حقیقت کی طرف متوجہ ہوں۔ اس عالمگیر انتشار کی تحریک کی محرک کیا چیز تھی ؟ یہ تحریک شروع کس طرح ہوئی ؟ کہاں تک یہ ٹھیک تھی ؟ غلطی کہاں پر ہوئی ؟ اور کونسا نقص باقی رہ گیا ؟ آنے والا

۱؎ Petrograd

انقلاب کہاں تک اشتراکیت کے اصولوں پہ قائم ہونا چاہیئے؟ اور کہاں تک نئے طریقوں کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے؟ اِس انقلاب کی تہ میں (کارل مارکس بھی یہی کہتا ہے) وہی نیا نظامِ عالم قائم کرنے کی خواہش موجود ہے جو فرانس کے انقلاب کی تہ میں تھی۔ وہ دراصل پہلا انقلاب تھا جس نے عوام کو دولتمندوں اور مذہب کے ٹھیکہ داروں کے پنجے سے رہائی دلوائی اور لوگوں کو آزادی کا مزا چکھایا۔ کارل مارکس نے جس تحریک کی بنیاد ڈالی اُس میں دولتمندوں اور علماءِ دین کے علاوہ مزدوروں پہ جو ظلم سرمایہ دار روا رکھ رہے تھے اُس سے بھی آزادی دلانے کی کوشش کی گئی۔ اُس کا خیال تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام ہی اِن سب خرابیوں کی جڑ ہے۔ مزدوروں کو جمع کرنے سے ہی ان خرابیوں کا قلع قمع ہو سکتا ہے۔ پہلے زمانہ کی خرابی اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھی۔ دراصل مارکس اور اُس کے ساتھی (اگرچہ میں بھی مارکس کو بُرا بھلا کہتا ہوں) نہایت ہی فدا کار انسان تھے۔ یہ یقین جانو۔

(بیچارے چھوٹے سے آپی چوہے نے ایسی باتیں پہلے کبھی نہ سُنی تھیں۔ وہ حیران ہوا۔ مگر پھر بھی وہاں بیٹھا ہی رہا)

اگرچہ مارکس اور اس کے ساتھی فدا کار تھے۔ مگر کچھ زیادہ لوگوں نے اُن کی قدر نہ کی۔ اِس کی کیا وجہ تھی؟

ہمارا دوست خدا بھی تو انیس صدیاں گذریں جب سے انقلاب کراتا آ رہا ہے۔ اُسے پورا یقین تھا کہ لوگ مان جائیں گے۔ مگر کیا ہوا؟ ایک نوجوان دولتمند سے ملاقات ہوئی جس کے پاس بہت سی دولت تھی۔ ویسے ہی جب ہیکل میں سے

صرافوں اور کبوتر بیچنے والوں کو نکالا تو اُسے یقین ہوگیا کہ لوگ نیکی کو پیار کرتے ہیں اور خدا کی بادشاہت ضرور قائم ہوجائے گی۔ مگر اُس سے کچھ نہ بن سکا۔ بارہ شاگرد معمولی سے آدمی تھے اور اُن کا خداوند مسیح کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا واقعہ کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتا۔ آخر اُس انقلاب کا کیا نتیجہ ہوا؟ تحریک ناکامیاب رہی۔ اور پولوس رسول جیسے ہوشیار اور چالاک آدمی اندر آ گھسے۔ کچھ امیر عورتیں عیسائی ہوگئیں۔ آپ یہ کتاب[1] پڑھیئے۔ حواریں بیچارے رہ گئے اور پادریوں نے زور پکڑا۔ مسیحیت کی پہلی صدی کے حالات پڑھیئے کس قدر خراب تھے۔ اُن کے سامنے بھی یہی سوال تھا کہ تحریک کو مل کر کس طرح چلایا جائے؟ نفس تحریک کی کس طرح حفاظت کی جائے اور تحریک کیونکر صحیح طریق پر چلے اور کون لوگ چلائیں تاکہ نیا نظام عالم قائم ہو؟

یہی سوال مارکس اور اُس کے ہمعصروں کے سامنے تھا۔ وہ بھی اِسی مسئلہ کا حل سوچ رہے تھے۔ انگلستان کی مزدور جماعت[2] کے متعلق مارکس کو اطلاعات صرف کتابوں کے ذریعے بہم پہنچی تھیں۔ سیاسیات کے عملی پہلو سے وہ بالکل ناآشنا تھا۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں کی کشمکش کے سوال کو لے بیٹھا۔ اُسے یہ خیال آیا کہ جیسے ہی مزدور اپنی خستہ حالی اور غربت کا احساس کریں گے۔ اُسی وقت وہ ایک نیا نظام جو انصاف اور بے غرضی پر مبنی ہو قائم کرلیں گے۔ یہ بات اُس کی سمجھ میں نہ آئی کہ دنیا کی تاریخ میں کبھی ایسا واقعہ پہلے ظہور پذیر نہیں ہوا۔ مزدور طبقہ صرف غصہ کھا کر ہی رہ جاتا ہے۔ اور اُن کا غصہ بے نتیجہ

---

[1] Irenaeus on Marcus. [2] Labour Union

ہؤا کرتا ہے۔ جب مظالم حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تو سوائے خون خرابے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ نئے سرمایہ دار پرانے سرمایہ داروں کی جگہ لے لیتے ہیں اور مزدوروں کا غصہ اُترتے ہی پہلے والی حالت پھر رونما ہو جایا کرتی ہے یعنی دونوں طبقے پھر لڑنے لگتے ہیں۔

سرمایہ داروں اور دولتمندوں کو اس بات کا پورا احساس ہوتا ہے یا کم از کم اُن کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ وہ نا انصاف اور فضول خرچ ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مزدور طبقہ بھی اُن کے اِس رویہ کو خوب سمجھتا ہے۔ اِس لیئے وہ اِس بات کے لیئے کوشاں رہتے ہیں کہ مزدور طبقہ اُن کا دستِ نگراں رہے اور کبھی مساوات کا دم نہ مارے۔ کیونکہ ایسا ہونے سے اُن کے اقتدار اور رُعب میں فرق آ جاتا ہے۔ اُس پر ہی تو اُن کی طاقت کا انحصار ہؤا کرتا ہے۔ اِس لیئے سرمایہ دار اور امیر لوگ انتہا پسند طبقے سے اکثر خوف کھاتے رہتے ہیں اور انقلاب پسند طبقوں سے متنفر ہوتے جاتے ہیں۔

غریب طبقہ جوں توں کر کے زندگی گذار لیتا ہے۔ اُن کو اِتنی سمجھ کہاں کہ وہ امیر طبقے کا مقابلہ کریں؟ وہ اِس بات کا خیال نہیں کرتے کہ امیر اُن کا خون چُوس رہے ہیں۔ بلکہ وہ تو اپنی حالت پر شاکر رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لیئے یہی مقدر ہؤا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب طبقے کا انقلاب ذہنی ہو جاتا ہے۔ مارکس کا خیال تو ایک نیا نظامِ عالم قائم کرنے کا تھا۔ مگر اُن میں سے بعض جو زیادہ سمجھدار اور چالاک ہوتے ہیں وہ اپنے حقوق طلب کرنے لگتے ہیں۔ باقی مزدور بھی اُن کے ایسا کرنے سے متأثر ہو جاتے ہیں۔ یہ انقلاب

وہ انقلاب نہیں جسے مارکس لانا چاہتا تھا۔ دوسرے طبقوں کے لوگ مثلاً غربا
اور طلبا۔ امیروں کے لڑکے اور حکام کے لڑکے اور دیگر متوسط طبقے کے لوگ
بھی اِس انقلاب میں شامل ہو جاتے ہیں اور ہُلڑ مچا دیتے ہیں۔ ہر طرح کے مصائب
برداشت کرتے ہیں۔ مزدور طبقے کے ساتھ ہر طرح سے ہمدردی دکھلاتے ہیں۔
بال اور ڈاڑھی نہیں منڈواتے اور قمیض پتلون سے باہر نکال کر پہننے لگتے ہیں۔
بھلا کہیں انقلابات اِس طرح کامیاب ہُوا کرتے ہیں؟ انقلاب کا لانا بڑے
ہوشیار اور لائق آدمی کا کام ہُوا کرتا ہے۔ ایسے لوگ بڑے کشادہ دماغ اور
عالی ہمت ہُوا کرتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ نیا نظامِ عالم کیسا ہوگا۔ بھلا
ایسے لوگ کبھی چھپے رہ سکتے ہیں؟ وہ مردِ میدان ہُوا کرتے ہیں!

امریکہ اور فرانس میں جب پہلے پہل اشتراکی تحریک شروع ہوئی
تو وہ لوگ بڑے آزادی پسند تھے۔ چونکہ وہ خود آزاد ہو گئے تھے اُنہوں نے
ایک غلطی کی۔ وہ سمجھے کہ کثرتِ آرا لے یا دانائی سے کام لینا ایک ہی بات ہُوا کرتی
ہے۔ اور مساوات اسے ہی کہتے ہیں۔ اگر حکومت لوگوں کے ہاتھ میں آگئی تو وہ
عوام کے فائدے کے لئے حکومت کو چلائیں گے۔ چنانچہ اشتراکیوں نے اوّل
ہی اوّل یہ غلطی کھائی۔ جوں جوں اُن کی تحریک زور پکڑتی گئی اصلیت اُن پر کھلتی
گئی۔ جس آزادی کو وہ حاصل کرنا چاہتے تھے وہی آزادی پاؤں تلے روندی
گئی۔ اندرونی نظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا جو نچلے طبقہ کے تھے اور جو
عقل سے بے بہرہ تھے اور صرف حکومت کے خواہاں تھے۔ چنانچہ روس میں یہی
بات ہوئی۔ آخر تحریک ایسی پستی پر پہنچ گئی کہ اس ملک کی آئندہ ترقی بالکل رُک

گئی۔

امریکہ میں انقلاب اور طرح سے ہوا اور وہاں بھی نتیجہ اچھا نہ نکلا۔ جو نظام حکومت وہاں بنایا گیا اگرچہ اچھا تھا مگر اختیار وکیلوں کے پاس چلا گیا جو سیاست دان بن بیٹھے اور لگے اپنا حکم چلانے۔ پہلے دندان سازوں کے ہاں ایک کرسی ہوا کرتی تھی جو سر کو جکڑتی تھی۔ اِس سے دانت نکالنے میں آسانی ہوا کرتی تھی۔ امریکہ میں آزادی کیا تھی گویا اُس کے دانت نکال دیئے گئے ہوں۔ وہ آزادی کس مصرف کی؟ لوگ یا تو Democrat[1] ہیں یا Republican اور اگر غیر جانبدار ہوں تو کچھ بھی نہیں۔ امریکہ والے نظامِ حکومت کے ساتھ اسی طرح بندھے ہوئے ہیں جس طرح خدا اپنی کائنات میں بندھ رہا ہے۔ آپ اسی سے نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اُن کی کیا حالت ہوگی؟ اگر یہ تباہ کن جنگ کہیں وہاں جا پہنچی تو آزادی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ مقابلہ تو زور کا ہوگا مگر ہاتھ بندھے رہے ہوں گے!

جب یہ سب کچھ ظاہر ہے اور ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں تو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم نئے سرے سے کچھ کریں۔ اشتراکی تحریک تو ہمارے سامنے ہے ہی اُسے ہم دیکھ بھال چکے ہیں۔ اچھی تو ہے مگر نامکمل ہے۔ سوال وہاں کا وہاں ہی رہ جاتا ہے۔ دو متضاد باتوں کو ایک جگہ جمع کرنا محال ہے۔ ایک طرف تو ہماری یہ خواہش ہے کہ دانائی اور فراست سے کام لیا جائے اور کوئی چیز اُس میں حارج نہ ہو۔ دوسری طرف ہم عوام سے یہ توقع رکھتے

---

[1] امریکہ میں دو سیاسی گروہوں کے نام

ہیں کہ وہ اِس نئے نظام کے قائم کرنے میں ہمارے مددگار بنیں اور کسی قسم کی رخنہ اندازی اور شرارت نہ ہونے پائے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

(اب نوح لمک ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگا)

مجھے اِن باتوں کے دُہرانے میں کوئی عار نہیں۔ میں یہ باتیں ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں۔ برگزیدہ لوگوں کا ہمارے اندر ہونا لازمی بھی ہے اور اُن سے ہمیں خطرہ بھی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ ڈر ہے کہ چونکہ وہ لوگ لائق اور سمجھدار ہیں حکومت اُن کے ہاتھ میں ہوگی۔ امیری اور حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہونے سے وہ کب اِس بات کو پسند کریں گے کہ عوام آزاد ہوں؟ بلکہ اُن کی تو یہ کوشش ہوگی کہ لوگ دبے رہیں اور اگر کوئی اُن کے مقابلے پر کھڑا بھی ہو تو گرا دیا جائے گا۔ اُن میں جو لوگ ذرا زیادہ ہوشیار اور قابل ہوں گے وہ طاقت پکڑ جائیں گے۔ پہلے زمانہ میں بھی ایسا ہی ہوا ہے حکومت چند برگزیدہ آدمیوں کے ہاتھوں میں آجایا کرتی ہے۔ بھلا ہماری کشتی کیونکر ایسے لوگوں سے بچ سکے گی؟ ہمیں بھی زیادہ سختی اور جوش اور ہوشیاری سے کام لینا پڑے گا۔ اِس بیماری کا علاج کوئی سادہ تو ہے نہیں۔ کاش کہ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے کام چل جاتا!

پھر نوح لمک نے آبی چوہے کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

عوام کے لئے تو یہ سوال مشکل نہیں۔ اُن میں بے چینی پھیلائی جا سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت ہو وہ وفادار ہوں۔ اُن کی حرکات کی نگرانی کرنی ہوگی۔ جو لوگ اِس قسم کی عالمگیر تحریکوں کو جو عوام کو پسند

ہوں چلانا چاہتے ہیں ہیں اُن کے حق میں ہوں۔ خاص کر جب انسان کے حقوق کا سوال در پیش ہو۔ ایسے حقوق کو طلب کرنے سے لوگوں کو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا سیکھتے ہیں۔ مثلاً سو سال گذر چکے جب سے لوگ آزادی اور حقوق کی آواز اٹھانے لگے۔ تب سے کس قدر ترقی ہوئی ہے؟ گویا انسان اپنے مقام کو سمجھنے لگا ہے۔ جب کبھی وہ اس بات کو بھول جائے تو اُسے یاد دلا دینا چاہیئے تاکہ وہ پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ چند ایسے آدمی ضرور ہونے چاہئیں جو ہمیشہ اس بات کی یاد دلاتے رہیں اور لوگوں کو بیدار کرتے رہیں۔ اکثر عوام کو دھوکا لگ جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ ہرگز یہ وہ لوگوں میں بھی تو ایسے نکتہ چین پیدا ہو جایا کرتے ہیں [مثال کے طور پر (دیکھو نوٹ)] جو خود دنیا سے بیزار ہوا کرتے ہیں۔

یاد دلانا ہم جیسے لوگوں پر بھی فرض ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہم جو کشتی کے بنانے والے ہیں کہاں تک اپنے آپ کو بمقابلہ اُس مقصد کے جو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں بھول سکتے ہیں۔ یہ بہت ہی مشکل کام ہے۔ مصائب کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ کئی قسم کی تکلیفیں جھیلنی ہوتی ہیں بہت تھوڑے شخص ہوں گے (جیسا کہ مذہب اور دیگر اصلاحی تحریکوں کی تاریخ سے ظاہر ہے) جو کامیاب ہوئے ہوں گے۔ گویا یہ کشتی والی تجویز بالکل نرالی ہے۔ یوں سمجھو کہ ایک نیا طریق زندگی یا یوں سمجھو کہ ایک نیا مذہب ایجاد کیا جاتا ہے اور ہم میں وہ اپنایا اور قربانی ہونی چاہیئے جو آج سے پہلے کبھی ظہور میں نہیں آئی۔ اور اس کی دلیل یہ ہے

نوٹ: Voltair, Montaigne, Shaw & Butler.

کہ اگر ایسی بات ہوئی ہوتی تو ہم اِس موجودہ دنیا ہی کو نہ دیکھ پاتے۔ گویا اس قسم کی قربانی اور ایثار پہلے کبھی نہیں دکھلایا گیا۔ قربانی تو جانے دیجئے اُس زمانے میں ایسے عالی دماغ انسان موجود نہ تھے۔ ہمیں تو تن من دھن سب کچھ قربان کرنا ہوگا۔

اِس بات کو یاد رکھئے۔ اِس نئی کشتی میں سوار ہونے والے بڑے سمجھدار لوگ ہونے چاہئیں اور وہ سب یکدل ہوں۔ فی زمانہ بعض بنیادی اصولوں پر بھی لوگوں کا اختلاف ہے۔ یہ بالکل نہ ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا ہوا تو کشتی اُلٹ جائے گی۔ صرف ایک خیال ہی درست یعنی حقیقت اصلیہ ہو سکتا ہے۔ باقی سب خیالوں کو ترک کر دینا چاہیئے۔ اگر کشتی میں ہم سب ہمخیال ہوں گے تو ساری دنیا پر قابو پا سکیں گے۔ آنے والی نئی دنیا میں آزادیٔ خیال تو ہوگی مگر ایسا نہ ہوگا کہ آپ جو جی چاہے سو خیال کر لیں۔ سب سے پہلے قابلِ غور خدا کا تخیل ہوگا۔ اسی خیال نے تو دنیا میں نیکی اور اتحاد کو اب تک قائم رکھا ہے۔ وہی خیال میرے دل میں بھی مضبوطی سے جم رہا ہے۔ خدا نے ہی اُس خیال کو میرے دل میں ڈالا ہے۔ اور یہ میں سب کچھ اُسی کی وجہ سے بیان کر رہا ہوں۔ مگر سچ پوچھو تو اب خدا عقل کے مقابلہ میں بالکل نہیں ٹھہر سکتا اور غائب ہوتا جاتا ہے۔ اُس کی مدد سے میں کشتی کو چلاؤں گا۔ مگر جب وہ جل دے گا تو میں یعنی نیا آدم[1] اکیلا ہی کشتی کو چلاتا رہوں گا۔

اِس پرانے تخیل میں اور نئے میں جو بنیادی فرق ہے اُسے خوب سمجھ

---

[1] New Adam

بنا چاہیئے۔ ہزاروں دارالعلوموں کے فلسفہ کے اُستاد دنیا میں تقریریں کرتے
ہرتے ہیں مگر وہ اصل مطلب کی طرف رجوع نہیں ہوتے۔ دو مختلف تخیل
ہمارے سامنے ہیں اور ہم نے اُن میں سے ایک کو اختیار کرنا ہے۔ ایک تو
پرانا اور قدیم خیال ہے جس کے مطابق دُنیا ایک خاص وقت پر ظہور میں
ئی اور خدا نے اُسے خلق کیا اور پھر اُسی نے حضرت آدم کو بنایا اور بعد میں
یا کیا ہوا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اب آخری منزل اس تخیل کی علم نفسیات ہے
جس کے مطابق ایک حقیقتِ واحدہ آخر ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے
ہے جو انسان کے نفس کے متعلق اب تک تحقیق ہو چکا ہے۔ (نوحِ لمک
سُن آپ چوہے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ آپ کا خیال شریف کیا ہے! مگر وہ بیچارا
کیا کہتا چپ پڑا رہا)

ایک دوسرا خیال جو پہلے کی نسبت بالکل مختلف ہے اور نیا بھی ہے
اُسے "علمِ تمدنِ انسانی"[1] بھی کہتے ہیں جس کے یہ معنے ہیں کہ انسان کے اندر
کوئی حقیقتِ واحدہ نہیں۔ بلکہ بہت عرصہ پاکر بکھری ہوئی کائنات میں
آہستہ آہستہ ایک نظام ظاہر ہوا جو انسان کے نفس کو بھی منظم کرتا گیا اور
عمل برابر جاری ہے۔ گویا آنے والی دنیا میں اتحاد اور آشتی اور محبت
اصول (جو قدرت میں پہلے سے ہی موجود ہے) ظہور پذیر ہوگا۔ اِسلئے
لوگ اِس کشتی میں سوار ہوں گے البتہ وہ یکدل ہونے چاہئیں اور یہ
نہ بالکل صاف کر دینا چاہیئے تاکہ بعد میں اِس موضوع پہ بحث مباحثہ

[1] Behaviourism

نہ ہو۔ گویا نئی دنیا کے باطن میں (غور سے سنئے گا) خدا کا انکار۔ کائنات کا جاری رہنا اور علم نفسیات کا مکمل مضمر ہونا چاہیئے۔ اگر ہم مل کر اس کام کو کریں گے تو دنیا بھی ترقی کرے گی اور ایک عالمگیر حکومت بھی قائم ہو گی۔۔۔۔۔۔۔

منتقیق کہتا ہے کہ پھر آپ خدا کو کشتی میں ساتھ کیوں لئے جاتے ہیں میں کہتا ہوں اس میں کیا حرج ہے؟ خدا دراصل ایک موہوم ہستی ہے اور ہم اُس سے یہ بات صاف کہہ دیں گے۔ ایسا کرنے سے اصلی خدا کا پتہ لگ جائے گا۔

اتنے میں ہلکی سی ہوا درختوں کی شاخوں میں سرسرانے لگی۔ نوحِ لمک سمجھا کہ کوئی شخص آیا ہے۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ صرف ہوا کا جھونکا تھا اور بس!

جب کوئی شخص پورے طور پر اُس نئے ارتقائی نظام کی اصل حقیقت کو سمجھ لیتا ہے تو پھر وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اُس کے لئے ہر قسم کی قربانی کرے حتیٰ کہ جان تک قربان کر دے۔ تب وہ شخص محقق بن جاتا ہے اور مقلد نہیں رہتا۔ اس لئے ترقی کرتا ہے۔ اگر کشتی میں اس قسم کے اشخاص موجود ہوں گے تو سمجھو ایک طرح سے کشتی رائل سوسائٹی کی طرح مضبوط ہو گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں تحریر و تقریر کی مکمل آزادی ہونی چاہیئے تو ہم ترقی کر سکیں گے۔ ہمیں بڑا محتاط رہنا پڑے گا۔ ایسا نہ ہو کہ پرانے خیالات

(نوٹ) یہ انگلستان میں سائنسدانوں کی سوسائٹی ہے۔ Royal Society

کے لوگ پھر ہمیں گمراہ کر دیں اور بہکا دیں۔ اِس لئے حقیقت ظاہر کر دینی ہوگی۔ تاکہ ہر شخص اُسے اچھی طرح سے جان لے۔ مَیں نے سُنا ہے کہ چین میں بچوں کو چینی اور شیشے کے برتنوں میں ڈال دیا کرتے تھے تاکہ لوگ انہیں دیکھ کر ہنسیں اور خوش ہوں۔ مذہب کو بھی ہم نے فی زمانہ اِسی قسم کا تماشہ بنا رکھا ہے۔ جو لوگ کشتی پر سوار ہوں وہ کھُلے ہوئے دماغوں والے ہوں اور آزاد خیال بھی ہوں اور سونے کی طرح بالکل کھرے ہوں۔ یہ کشتی ہی تو آنے والی نئی دنیا بنائے گی۔ ہمارا مرکزی ادارہ مضبوط ہونا چاہیئے تب ہی تو دوسرے ملحق ادارے خاطر خواہ ہوں گے۔ کام تو نہایت ہی مشکل ہے اور پہلے کبھی انسان کو ایسی مشکل پیش نہیں آئی۔ جب ہم غور سے دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ افراد جب نوعِ بشر سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں تو تباہ ہو جاتے ہیں۔ اُن کی نجات اِسی میں ہے کہ وہ دوسروں سے مل کر کام کریں۔ فی زمانہ انفرادی زندگی ممکن نہیں۔ اپنے آپ کو نوعِ بشر کے حوالے کر دینا گویا زندگی ہے۔ ورنہ ہمیشہ کے لئے مر جانا ہے۔ آخر انفرادی حیثیت میں انسان کیا چیز ہے؟ اُس کی کوئی قیمت نہیں جس طرح جگنو تھوڑے سے عرصے کے لئے اندھیرے میں روشنی چمکتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے یہی حال انسان کا ہوتا ہے۔ اگر انسان دوسروں کے لئے جیتا ہے تب ہی زندہ رہ سکتا ہے۔

(آبی چوہے نے جب یہ سب کچھ سُنا تو ڈرا اور اُس نے پانی میں ڈبکی لگائی اور غائب ہو گیا)

نوحِ لمک وہاں سے اُٹھا اور آپی چوہے کو تو بالکل بھول گیا اور کہنے لگا۔ یہ تو سب کھُلی ہوئی باتیں ہیں۔ چلو چلیں اور اُس تحریری یادداشت کو مکمل کریں۔ شائد وہ بوڑھا شریف آدمی (خدا) پھر آجائے۔ ایسے اشخاص کی بھی تلاش کرنی چاہیئے جو آنے والی دنیا کو تعمیر کر سکیں۔ اگرچہ حالات بہت خطرناک ہیں مگر دنیا بھی بہت بدل چکی ہے۔ ایسے شخص مل ہی جائیں گے۔ فی الحال اُن کے نام ذہن میں نہیں آتے۔

نوحِ لمک ایک کشتی کے لیئے سواریوں کی تلاش میں نکلا۔ چونکہ اُن کے نام اُس کے خیال میں نہ آتے تھے وہ ایسے گروہوں کے متعلق باقاعدہ سوچنے لگا جن میں سے افراد کو چُن لیا جائے۔ چنانچہ اُس نے ہر گروہ اور ہر جماعت کی طرف نظر دوڑائی۔ پہلے دولتمند طبقے کو لیا جنہوں نے دولت ورثہ میں پائی تھی اور صاحبِ اختیار اور اقتدار تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو امارت پسند ہیں۔ مگر ظاہر ایسا کرتے ہیں کہ اُنہیں روپے پیسے سے کچھ بھی لگاؤ نہیں۔ اِس طبقے کے اکثر لوگ ایک نئی دنیا بنانے کے خیال کو بھلا کیونکر پسند کرتے!

وہ تو پہلے سے برگزیدہ لوگوں میں سے ہیں۔ اُنہیں کیا غرض پڑی ہے کہ نئی دنیا بنے؟ اسی لئے تو وہ لوگ بالشوکیوں سے اور انتہا پسندوں سے خوف کھاتے ہیں اور اپنی جان اور عزت کو بھی قربان کرنے کے لئے حاضر ہیں۔ بشرطیکہ کیسی نہ کسی طرح اُن کی دولت برقرار اور اُن کا اقتدار باقی رہے۔ مگر یہ طبقہ جمود کی حالت میں ہے اور ترقی نہیں کرتا۔ جو امیر لوگ سمجھدار ہیں وہ بیکار سے ہو گئے ہیں اور اُن کی اولاد جوانی کے جوش میں انقلاب پسند ہوتی جاتی ہے۔ نوح ملک نے سوچا کہ امیرزادے انقلاب چاہتے ہیں۔ وہ عوام کو تو پسند نہیں کرتے مگر خود آزاد ہونا چاہتے ہیں اور ذہنی آزادی کے خواہاں ہیں۔ کسی زمانے میں ایسے نوجوان امیرزادوں نے ہی عوام کو آزادی کا پروانہ[1] دلوایا تھا اور لوگوں کو مذہبی توہمات سے رہائی دلوائی تھی۔ اطالیہ اور انگلستان میں جو ترقی سائینس میں ہوئی اُنہی کی وجہ سے ہوئی۔ مشرقی ممالک میں ایسے لوگ ہی علوم و فنون کی سرپرستی کرتے رہے۔ سوال تو یہ ہے کہ ایسے سمجھدار اس بڑے طوفان کے سامنے جو سب دُنیا کو گھیرے ہوئے ہے کیا رویہ اختیار کریں گے؟ کیا اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں کنجی دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ بائرن[2] سے لے کر برٹی رسل[3] تک کتنی ہی ممتاز ہستیاں ہمارے درمیان ہو گذری ہیں جو بڑی انقلاب پسند تھیں اور جو چاہے کتنا ہی نقصان ہو جاتا بات کو صاف صاف کہہ دیا کرتی تھیں اور چونکہ وہ خود ذہنی طور پر آزاد تھے اُن کے دیکھا دیکھی دیگر مصنّفین اور ماہرین بھی آزادی سے اپنے خیالات کا

---

[1] Magna Charta [2] Byron [3] Bertie Russel

اظہار کیا کرتے تھے اور جو دل میں آتا وہ لکھتے۔ ہماری کشتی میں اِس قسم کے
آزاد خیال جو آن والے بھی ہوں سوار ہو سکتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کب تک
وہ ایسے آزاد خیال رہ سکیں گے اور ساتھ ہی اُن کا غرور بھی برقرار رہے گا
یا نہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی دوسروں کی مانند ہو جائیں اور پھر کون اُن
میں سے کشتی کے مصرف کا رہ جائے گا؟ ہمیں ضرورت ہے ایسے لوگوں کی
جو سمجھدار بھی ہوں اور ساتھ ہی ہمت والے بھی ہوں۔

پھر یہ امیرزادے ٹھہرے! اکثر اُن میں سے قدامت پرستی سے تنگ
آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ماضی میں تو وہ کئی ایک بُرائیوں کا شکار ہو جایا کرتے
تھے۔ دُور دراز مُلکوں میں چلے جاتے۔ وہاں دولت کماتے یا مُلک گیری میں
مشغول ہو جاتے۔ اُن میں سے جو ذرا زیادہ سمجھدار ہوتے وہ انقلاب پسند ہو
جاتے اور اُسی قسم کی کتابیں پڑھنے لگتے یا کسی فن میں مہارت حاصل کر لیتے۔ کیا
ہماری کشتی کو شیلی[1] جیسے آدمی میسّر آ سکتے ہیں؟ وہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا
ہے کہ اگر اُس کا کوئی آمدنی کا ذریعہ نہ ہوتا تو وہ کیا کرتا؟ فی زمانہ اکثر امیرزادے
نوجوان فوج میں بھرتی ہونا پسند کرتے ہیں۔ جب یہ مصیبت ہم پر نہ آئی تھی
تو اور بات تھی۔ یہی نوجوان چار حصوں میں منقسم کئے جا سکتے تھے پہلے تو وہ
جو بڑے بڑے عہدوں کے پیچھے دوڑا کرتے تھے اور جن کا یہ خیال تھا کہ سب
کام حسبِ معمول ہوتا ہی رہے گا۔ دوسری قسم کے وہ نوجوان تھے جو دیکھ رہے
تھے کہ آفت سر پر آ رہی ہے اور اپنی امیری اور اقتدار کو چھوڑنے کے لئے تیار

---

[1] Shelley (نوٹ) ایک مشہور شاعر ہو گذرا ہے۔

بھی تھے مگر لاپرواہی کی وجہ سے اپنے خیالوں میں ہی مست رہتے تھے۔ تیسری قسم کے وہ نوجوان بھی تھے جو جانتے تھے کہ اُن کی امارت خطرے میں ہے وہ بالشو کی خیالوں کا مقابلہ کرتے تھے اور دوسرے نوجوانوں کو بھی اُس طرف جانے سے روکتے تھے۔ چوتھی قسم کے امیرزادے وہ تھے جو بالکل انقلاب چاہتے تھے اور انقلاب پسند لوگوں کے زیر اثر تھے۔ مگر انتہا پسند نہ تھے۔

اِن میں سے چوتھی قسم کے نوجوان کشتی کے مطلب کے معلوم ہوتے ہیں۔ جو امیرزادے نوجوان انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں اشتراکی خیال کے بن جاتے ہیں اُن کی حالت بھی ویسی ہی ہوا کرتی ہے جس طرح مارکس کے زمانہ میں اُن لوگوں کی تھی جو ایک دوسرے سے بڑھ کر بڑا بننا چاہتے تھے۔ دونوں حالتوں میں ماحول کا اثر کام کرتا ہے۔ مثلاً اگر شبلی کے زمانے میں اشتراکی تحریک ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ شاعر بھی اُن میں شامل ہو جاتا۔ کچھ عرصے کے لئے اُس کے زیر اثر ضرور آجاتا۔ چاہے بعد میں وہ اشتراکیوں کے برخلاف ہی ہو جاتا۔ نوجوان شروع شروع میں انقلاب پسند ہونے کی وجہ سے اُس طرف جھک جایا کرتے ہیں۔ انہیں بعد میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اپنی ضد پہ اڑے رہیں یا اُن خیالات کو ترک کر دیں۔ بیچاروں کو زیادہ سمجھ تو ہوتی نہیں اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آج وہ نوجوان اشتراکی ہوں اور بڑی ڈینگیں ہانکتے ہوں اور کل جب ہوش میں آئیں تو کشتی میں داخل ہو جائیں۔

فی زمانہ شہروں میں کسان اور اَن پڑھ لوگ بہت کم رہ گئے ہیں۔ بھلا ہماری کشتی میں آکر وہ لوگ کیا کریں گے جن کو اتنی تمیز نہیں کہ روس

کی حالت ۱۹۱۷ء میں کیا تھی اور اب ۱۹۴۰ء میں کیا ہے؟ موجودہ انقلاب کچھ اور طرح کا ہے۔ کم از کم اتنی تو سمجھ ہونی چاہیئے تاکہ فرق کیا جا سکے۔

نوح لمک پچھلے بیس سال میں انگلستان اور امریکہ کے ملکوں میں جو کچھ اشتراکیت کے متعلق شائع ہو چکا تھا اُس پر نظر ڈالتے ہوئے کہنے لگا کہ اُس زمانے میں لوگ اِس رُوسی تحریک کے بڑے دلدادہ ہوا کرتے تھے۔ اپنی عقل تو بالکل استعمال ہی نہ کرتے تھے! اشتراکیت کی تحریک دراصل مغربی ممالک میں شروع ہوئی اور وہاں ہی پھلی پھولی۔ مگر تحریک میں جو لوگ شریک ہوئے وہ اُسے دیر تک چلا نہ سکے۔ بات یہ ہوئی کہ وہ سیاسی گورکھ دھندے میں اُلجھ گئے۔ سیاست تو ایک ٹیڑھی کھیر ٹھہری اور ہے بھی بے معنی۔ جب کوئی تعمیری کام کرنا یا لوگوں کو آزادی دلانی منظور ہوتی ہے تو اشتراکیوں کے بنائے ہوئے قوانین درمیان میں حائل ہو کر سب کام بگاڑ دیتے ہیں۔ نہیں معلوم یہ مغربی نوجوان کیوں روسی نظام میں تغیر و تبدل نہیں کرتے؟

نوح لمک نے خیال کیا کہ شاید اِس قسم کے امارت پسند اشتراکیوں کو وہ نہ سمجھ سکا۔ شاید وہ خود اپنے آپ کو بہتر سمجھتے ہوں گے۔ کہنے لگا مجھے تو ایسے لوگوں سے کچھ توقع نہیں۔ جب کشتی تیار ہوتی ہو تو کچھ ذرا سا کام کر دیں گے۔

امیروں کے طبقے کو چھوڑ کر اب نوح لمک پیشہ ور گروہ کی طرف متوجہ ہوا۔ کہنے لگا۔ دیکھیں اُن کے گھروں اور بال بچوں کا کیا حال ہے۔ اِس

طبقے میں چھوٹے اور بڑے نہیں ہوتے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ عورتیں جو ذرا متموّل
گھرانوں کی ہوتی ہیں اُن کے کپڑے کم متموّل گھرانوں والی عورتوں کے مقابلہ
میں ذرا زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔ مگر پوشاکوں کی طرز اور فیشن میں کچھ فرق نہیں
ہوتا۔ بود وباش اور معاشرت تقریباً یکساں ہوتی ہے۔ ہاں اوّل الذکر کچھ زیادہ
سلیقہ رکھتی ہیں۔ مگر ایسی مصیبت کے وقت کچھ ایسا فرق معلوم نہیں ہوتا۔
امیروں کے طبقے کے مقابلہ بہر حال اُن میں غرور بہت کم ہوتا ہے۔ مثلاً وکیل
اور ڈاکٹر وغیرہ اپنی شہرت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس طبقے کے لوگ
بڑے تعلیم یافتہ ہوا کرتے ہیں۔ اور امیروں کی نسبت زیادہ سمجھ دار بھی ہوتے
ہیں۔ ایک تو یہ لوگ سوچ کر کام کرتے ہیں اور حالات کو خوب اچھی طرح سمجھتے
ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آفت اُن کے سر پر ہے۔ مگر نقص یہ ہے کہ سوائے اپنے
پیشہ کے عملی زندگی کا اُن کو کوئی تجربہ نہیں ہوتا اور وہ کوئی ذمہ داری اپنے
سر پر لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ یہ لوگ سیاسی معاملات میں مداخلت
نہیں کرتے۔ ہاں اگر کوئی وکیل یا بیرسٹر ہو تو اُس کی دوسری بات ہے۔ وہ بھی
خاص طرح کی سیاست میں حصہ لیتا ہے۔ اور اُس کی سیاست اس مصیبت
کے وقت کچھ کام نہیں دیتی۔

پیشہ ور طبقے کے لوگوں کے لڑکے اور لڑکیاں جن کی تعلیم پر اُن کے
والدین بہت روپیہ خرچ کرتے ہیں امیر زادوں کی طرح اُنہی جماعتوں
میں بیٹھ جاتے ہیں جنکا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ہاں یہ اُن کی طرح اتنے جوشیلے
نہیں ہوتے۔ اپنی ڈگریوں[1] کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ وہ کب اس کشمکش

---

[1] Degrees

کے نزدیک آئیں گے؟ کہیں گے خیال تو بہت اچھا ہے اور خوب تعریف کرینگے۔ میں تو اُن کو خوب پہچانتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کریں گے "اِس ہفتہ میں بہت کام ہے"۔ "اگلے ہفتہ ریڈ کراس[1] بازار لگنے والا ہے اور میری بیوی وہاں جانا چاہتی ہے وہ اکیلی کیسے جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ غرض اِس سارے کے سارے طبقے کا یہی حال ہے۔ چونکہ کچھ زیادہ خوشحال طبقہ نہیں۔ اِس لئے ایسے مسائل کو کس طرح سوچ سکتا ہے؟ مجھے تو اُن کے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اب یہی پادری اور مدرسوں کے اُستاد اور اخبار نویس۔ شائد یہ کچھ کام دے جائیں۔ پادریوں کی جماعت تو کچھ نہ کر سکے گی۔ اُن کے دماغ تو تفسیروں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ اِس میں تو شک نہیں کہ قدیم زمانے میں جو لوگ گرجوں میں رہا کرتے تھے اور مطالعہ میں مشغول رہتے تھے۔ اُنہوں نے لوگوں کے سدھار کے لئے بہت کچھ کیا۔ مگر موجودہ زمانے کے پروٹسٹنٹ پادری خدا کے متعلق اُتنا ہی جانتے ہیں جتنا کچھ میں جانتا ہوں اور وہی رائے رکھتے ہیں جو کہ میں۔ میرے خیال میں تو وہ کتاب مقدس کو غور سے پڑھتے تک نہیں اور اُن کے پاس اِتنا وقت کہاں کہ وہ موجودہ مسائل کا حل اپنے وعظوں میں پیش کر سکیں؟ ہاں اِس زمانے کے ماحول نے اُن پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ مگر سامعین کا کیا علاج اپنے خیال تو اُن کو اضطراب میں ڈال دینگے میں بعض پادریوں کو سمجھاؤں گا۔ مگر وہ مجھ سے اڑ پڑیں گے۔ وہ روحانیت

---

[1] Red Cross

پرزور دیں گے۔ اگرچہ انہیں اُس کے متعلق خاک بھی معلوم نہیں۔ میں خدا
سے کہوں گا کہ وہ جاکر اُن کو سمجھائے۔ مگر حیرانی تو اِس بات کی ہے کہ خُدا
لاٹ[ے] پادری یا کسی اور بڑے پادری کے پاس ملاقات کرنے کیوں نہیں گیا؟
میرے پاس کیوں دوڑا ہوا آیا؟ شاید خدا پادریوں کو پسند نہیں کرتا جس
طرح کی پوشاک پادری لوگ پہنتے ہیں اُسے پسند نہیں!

اب رہے مدرّس اور ایسے ویسے اخبار نویس۔ یہ لوگ چونکہ بڑے
ہوشیار ہوتے ہیں اپنے پیشہ کی حدود سے باہر نہیں نکلتے۔ ہزاروں اُستادوں
کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہوگا۔ آخر ہم اِن بچوں اور نوجوانوں کو کس
قسم کی تعلیم دے رہے ہیں؟ اِس تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ مرتے وقت یہ نوجوان
کیا کہیں گے؟ اور کیا معلوم کب مرجائیں۔ ایک سال میں یا ایک مہینے میں۔
کون جانتا ہے؟ کس قسم کی تعلیم ہم ان کو دے رہے ہیں؟ اُن کے دل میں یہ
سوال پیدا تو ہوتا ہے مگر کیا کبھی وہ سنجیدگی سے اِس پر غور بھی کرتے ہیں؟
اگر راتیں جاگیں اور منتظمین کو نئے خیالات سے آگاہ کریں تو کچھ بات بنے۔

جب میں ایسے لوگوں سے درخواست کروں گا کہ چلو کنشت میں تو وہ
کہیں گے ہمیں تو بچوں کی جان بچانی ہے۔ شہر خالی کرنے ہیں اور بچوں کی
تعلیم کا بندوبست کرنا ہے۔ خدا جانے امتحانوں میں کیا ہوگا۔ وہ کیوں میری
طرف متوجہ ہوں گے؟ یہ تو وہی بات ہوئی کہ آندھی چل رہی ہو اور سڑک کے
بدر لوگوں سے یہ کہا جائے میاں یہ جھاڑو بڑی اچھی ہے اِسے خرید لو۔ اب

ے Archbishop of Canterbury

رہے اخبار نویس۔ یہ لوگ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی خبر سنتے ہی رہتے ہیں۔
آج ایک خبر تازہ اور سچی اور عجیب ہے۔ کل وہی خبر کچھ بھی وقعت نہیں رکھتی
ہم جیسے لوگ اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھے پڑھتے رہتے ہیں۔ وہ کیا
جانیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ مگر اخبار نویسوں کے پاس ہر طرف سے
خبریں اڑی چلی آتی ہیں۔ اگر ان سے آ کر یہ کہا جائے کہ بھائی دیکھو دنیا تباہ
ہو رہی ہے۔ تم مزے میں بیٹھے تماشہ دیکھ رہے ہو۔ تو وہ کہیں گے ہر اخبار کا
دفتر میں یہی حال ہے۔ ہم کیا کریں؟ اگر میں ان سے کہتا ہوں کہ بھائی کچھ بچاؤ
کی صورت سوچو۔ تو اخبار نویس جواب میں کہتے ہیں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ تم
تو جانتے ہی ہو اور ہم بھی جانتے ہیں کہ دنیا ختم ہونے والی ہے۔ اب بچائیں
تو کیسے؟ وہ گھڑی تو آئے گی ہی چاہے کوئی سوتا ہو یا جاگتا ہو۔

اخبار نویس کہیں گے۔ تمہارے کشتی والے خیال کا مذاق تو اڑایا جا
سکتا ہے۔ ایک کارٹون[۱] اس قسم کا بنایا جا سکتا ہے جس میں دو بلیاں اور دو
بھیڑیں کشتی پر آپ کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی ہوں۔ آج کل اخباروں میں
لوگ یا تو جنگ کی خبریں پڑھ لیتے ہیں یا کارٹون دیکھ لیتے ہیں۔ یہ ہے حال
اخبار نویسوں کا۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ تباہی نزدیک ہے! وہ تو صاف
صاف کہتے ہیں کہ بھائی ایسے مضامین مت لکھو جو شائع نہ ہو سکیں اور
بیچارے کریں بھی کیا۔ مجبور ہیں۔ کوئی ہی ایسا ہوگا جو ذرا دل کا مضبوط یا
یقین میں پکا ہو۔ ان کے اطوار مختلف ہونے ٹھہرے۔ میری کشتی میں بھی

---

۱ Cartoon

رنگا رنگ کے لوگ سوار ہوں گے۔ کوئی کہے گا میں اُس کے ساتھ نہیں رہتا۔ اگر وہ ہوگا میں نہیں آؤں گا۔ اصولی اختلاف نہ بھی ہو تو بھی فروعی اختلاف تو ذرا ذرا سی بات پہ ہو ہی جائے گا۔

مجھے اِس بات کا خیال نہ رہا کہ ہماری کشتی میں عورتوں کا ہونا بھی لازمی ہے۔ عورت ذات بڑی ہوشیار ہوا کرتی ہے۔ اُس کی وہی حالت ہے جیسے دیا بیا گرا تیہہ رہا ہو اور عین اُس مقام پہ پہنچنے والا ہو جہاں سے آبشار بن کر گرتا ہے۔ اس بات کا احساس ہوتے ہوئے بھی وہ بہتی ہوئی چلی جاتی ہے اور کچھ پرواہ نہیں کرتی۔ یہ حال ہے اُس وسطی تعلیم یافتہ طبقے کا جس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں! اور جو اس سے بھی نچلے طبقے کے لوگ ہیں بھلا اُن کا کیا حال ہوگا؟ اُن لوگوں کا اللہ ہی مالک ہے۔ خراب اور خستہ حال ہیں! تباہی نے وقت سے پہلے اُنہیں آگھیرا ہے! ہم تو آہستہ آہستہ نچلے طبقے کو تعلیم دے رہے تھے اور ابھی اس کا اثر سب سے نیچے والے حصہ میں نہ پہنچا تھا کہ یہ آفت آگئی۔ سستی چھپ چھپ آنے والی کتابیں عوام کے لئے شائع ہوگئی تھیں۔ لوگ کچھ تھوڑا بہت کماتے اور پھر فرصت کے وقت لائبریریوں میں چلے جاتے اور کچھ پڑھتے رہتے تھے۔ معمولی گاڑی بان کو ہی لے لیجئے آپ سے ہر معاملہ پہ گفتگو کرے گا۔ سوچ بچار کرنے والے لوگ تو کم ہی ہوا کرتے ہیں۔ پھر بھی لاکھوں کی تعداد میں پڑھے لکھے مل جائیں گے اُنہیں کیا؟ جو چاہے کہیں۔ وہ تو بات کرنے میں امیروں سے

Nagra

لگا کھاتے ہیں۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ عوام کے اندر اِس قدر سمجھ کہاں تھی۔ اب تو لوگ بڑے چالاک ہو گئے ہیں۔

اب مزدوروں کے طبقے کو لیجئے۔ کیا وہ انقلاب لا سکیں گے؟ ہیں تو ٹڈی دَل کی طرح بے تعداد؟ مگر اس میں نقص یہ ہے کہ سمجھ نہیں رکھتے۔ اُن کے لیڈر[1] کچھ ایسے ویسے ہی ہیں رَو کے ساتھ۔ وہ بھی بہہ جاتے ہیں۔ جدھر مزدور۔ اُسی طرف اُن کے لیڈر بھی چل دیتے ہیں۔ اُن کی بھلی کہی! ہوتے تو مزدوروں کی نسبت ذرا سمجھدار ہیں۔ پڑھے لکھے بھی ہوتے ہیں مگر اُنکا زاویہ نگاہ تنگ ہوا کرتا ہے۔ اگر نظر فراغ بھی ہو تو سیاسیات کی اُلجھن میں پھنس جاتے ہیں۔ اُس میں اُنہیں مزا آتا ہے۔ پھر تو پڑھنا لکھنا بھی بھول جاتے ہیں۔ الوداع کہہ دیتے ہیں۔ ذرا لائق ہوئے۔ آگے بڑھے۔ پہلے مزدور جماعت کے لیڈر بنے۔ وہاں سے پارلیمنٹ[2] کے ممبر بن گئے۔ پھر کیبنٹ[3] کے ممبر بن گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ مگر ہیں بیوی ایسی نہ ہوتی جو لائق ہو۔ مل کر کام کرنا نہ سیکھا بھلا ایسے لوگ کس طرح کشتی میں داخل ہو سکتے ہیں! جو ذرا قابل ہوئے اُن کا حال ویسا ہی ہوتا ہے جیسا اخبار نویسوں۔ اُستادوں اور دیگر پیشہ وروں کا جن کے متعلق اوپر ذکر آیا ہے۔ بات سمجھ تو جاتے ہیں۔ مگر جب موقعہ ہاتھ سے چلا گیا تو کیا فائدہ؟ کسی اور کو سمجھا نہ سکے۔ کہیں گے "جناب نوح لمک! آپ اگلے ہفتے تشریف لائیے گا۔" جو آپ فرماتے ہیں وہ بہت ٹھیک ہے" مگر کہہ کر منہ پھیر لیں گے۔ اور طوفان آتا ہی ہوگا۔ وہ دیکھو کشتی نے سیٹی دیدی

---

[1] Leader [2] Parliament [3] Cabinet

چلو ارارط کو! کشتی پر سوار ہو جاؤ!

جب کشتی چل دے گی تو کہیں گے ہمارے لئے بھی جگہ رکھنا ہم ابھی آتے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے! پانی چڑھ رہا ہے اور وہ لوگ تو تیرنا بھی نہیں جانتے کبھی سیکھا بھی تو نہیں! جیسے ہی کشتی چلی گئی لوگ ڈوبتے اور غوطے کھاتے دکھائی دیئے!

نوح لمک کہنے لگا کہ کیا کشتی میں لوگوں کے بچانے کا سامان[1] ساتھ رکھا جا سکتا ہے؟

اب خدا بول اُٹھا۔ اگر آخری دم بھی کوئی توبہ کرے تو میں معاف کر دیتا ہوں۔ مگر جب کشتی چل دی ہو تو توبہ کرنے سے کیا فائدہ؟ اُس وقت میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ سزا دوں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ہم بچانے کا سامان ساتھ نہ لائے۔ ورنہ لوگ تو بچنے کے لئے بھیڑ لگا دیتے! ویسے لوگ تو کشتی پر سوار نہ ہو سکے! وہ دیکھو کس طرح بڑے بڑے عزت دار لوگ ڈوب رہے ہیں!

اِتنے میں نوح لمک نیند سے بیدار ہوا۔ کہنے لگا یہ کیا معاملہ ہے؟ میں تو مطالعہ کے کمرے میں یادداشت لکھ رہا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ یہ کشتی کا کمرہ ہے۔ اور میں ایک کشتی میں سوار ہوں!

اجی حضرت! یہ تو کشتی کے کپتان کا کمرہ ہے۔ ہمیں اس کشتی میں سوار ہوئے تین روز ہو گئے۔ آپ تو بیہوش ہی پڑے رہے اور اچھا ہوا کہ آپکو

---

1. Life belts

کچھ معلوم نہ ہُوا۔ طوفان بڑا سخت تھا۔ سواریاں بہت نہ گھبرائیں۔ ہر شام کو کشتی پر خوب بحث مباحثہ جاری رہا۔ پچھلے اتوار آپ نے جو وعظ کیا وہ نہائیت ہی اچھا تھا۔ اُس کا موضوع "آنے والا نیا مذہب" تھا۔ پچھلے دینوں سے مقابلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "نیا دین" بڑا ہی زبردست ہوگا۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ انقلابِ عظیم ہونے والا ہے۔ اِس پہلو پر تو آپ نے خوب روشنی ڈالی۔ اِس میں تو شک نہیں کہ فی زمانہ سائینس نے بڑی ترقی کی ہے اور انسانی دماغ نے بڑا نشو ونما پایا ہے.....

نوحِ لمک یہ سُن کر کہنے لگا۔ کچھ کچھ مجھے یاد تو آتا ہے۔ کیا کشتی پر ہر اتوار کو وعظ بھی ہُوا کرتا تھا اور میں وعظ کیا کرتا تھا!

اجی حضرت! ہر کشتی پر ہر اتوار کے دِن وعظ ہُوا کرتا ہے۔ سمندر میں خشکی کی نسبت ہم خدا سے بالکل زیادہ نزدیک ہوتے ہیں کشتی والے تو اِس بات کو خوب جانتے ہیں۔

نوحِ لمک نے دیکھا کہ سچ مچ خدا ارلیوڑھا شریف آدمی، پہلے کی نسبت بڑا ہی تندرست اور باوقار معلوم دیتا تھا۔ اُس نے اُس سے پوچھا کہ آپ کا کشتی میں کیا کام؟

خدا نے کہا کہ میں ہی تو کشتی کے ہر حصہ میں سمارہا ہوں!

نوُحِ لمک چُپ سا ہو گیا اور کہنے لگا۔ جائیے کچھ اور کام کیجئے۔

خدا نے کہا۔ اچھا جاتا ہوں۔ میں جا کر باجا بجاتا ہوں۔ مجھے باجا بجانے کا بڑا ہی شوق ہے۔ کیوں حضرت! میں باجا بجاؤں!

نوٹ:۔ مصنف لکھتا ہے کہ ابھی کہانی ختم نہیں ہوئی۔ نہ معلوم آگے کیا ہو۔ . . . .

کشتیِ نوح کے مترجم کی تصانیف

(۱)

مذاہبِ عالم

اس کتاب میں دنیا کے آٹھ بڑے مذاہب کے بارے میں نہایت عمدگی سے واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے۔ چونکہ تعصّب کی بنیاد موٹے طور پر حقیقت سے لاعلمی ہے لہذا حقیقت سے باخبر ہونا ہر بشر کا فرض ہے۔ یہ کتاب خاص کر اسی مقصد کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی فہرست مضامین مندرجہ ذیل ہے:۔

۱۔ مذہب پر ایک نئی نظر (۲) مربیانِ عالمِ انسانی (۳) ہندو دھرم اور اصلاحی تحریکیں (۴) بدھ دھرم اور جین مت (۵) زرتشتی یا پارسیوں کا دھرم (۶) چین اور جاپان کے دھرم (۷) یہودیوں کا مذہب (۸) عیسائی مذہب (۹) دینِ اسلام (۱۰) بہائی مذہب (۱۱) مختلف مذاہب کی متبرک کتابیں (۱۲) مستقبل کا مذہب۔

۱۷۶ صفحے لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ قیمت بارہ آنے

محصول ڈاک بذمہ خریدار

ہمارے مربیّ اور اُن کی تعلیم

حقیقت ایک ہے صرف بیان کے طریقے مختلف ہیں۔ اِس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔ بڑے بڑے مربیانِ عالمِ انسانی کی مختصر سوانح حیات اور تعلیم اس کتاب میں درج ہے۔ "مذاہبِ عالم" کے پہلو بہ پہلو اس کا مطالعہ ازبس مفید ہوگا۔

۱۳۴ صفحے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت ۱۲ر آنے

محصول ڈاک بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:-

پروفیسر پریتم سنگھ ایم۔اے ۳۹ ٹمپل روڈ لاہور

مہاتما گاندھی کا پیغام

طالب علموں کے نام

مترجمہ پروفیسر پریتم سنگھ ایم۔اے لاہور

اِس کتاب میں اُن مضامین کا عام فہم اُردو ترجمہ کیا گیا ہے کہ جو مہاتما گاندھی نے گذشتہ اٹھارہ برس کے عرصہ میں طلباء کے متعلق لکھے ہیں اور جنہیں آنند۔ٹی ہنگورانی صاحب نے بڑی محنت سے فراہم کر کے انگریزی میں شائع کیا۔ طالب علموں کے لئے خصوصاً اور دیگر تعلیمیافتہ اصحاب کے لئے یہ کتاب پڑھنے لائق ہے۔

حجم ۲۶۴ صفحے قیمت ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ:

پروفیسر پریتم سنگھ ایم۔اے ۲۹ ٹمپل روڈ لاہور

(یہ پروفیسر پریتم سنگھ نے امرت الیکٹرک پریس ریلوے روڈ۔ لاہور میں باہتمام دھرم چند بھارگو بی۔ایس سی چھپوا کر ۲۹ ٹمپل روڈ لاہور سے شائع کی)